سمیع الحق

قومی اسمبلی میں دستور کی اسلامی ترمیمات کا کیا حشر ہوا؟

★

آئین سازی کا کام بالآخر جس بحران کا شکار ہوا، اس کا اندازہ پہلے ہی دن حزبِ اختلاف کی ترمیمات کے ساتھ اکثریتی پارٹی کا رویہ دیکھ کر ہوا۔ مسئلہ اقلیت اور اکثریت کا نہیں بلکہ ایک مخلصانہ اور مفاہمانہ جذبہ اور معقولیت پسندی سے کام لیکر ملک کو ایک ایسا آئین دینے کا تھا جو اپنے اسلامی، جمہوری، وفاقی اور عوامی پہلو سے پورے ملک کے مصالح اور ضروریات کا کفیل ہو، اسے ۲۵ سالہ طویل مگر تلخ تجربات سے سبق لیکر مرتب کیا گیا ہو اور ارکان اسمبلی کی ہر معقول بات کو باہمی افہام و تفہیم اور غور و فکر سے قبول کر لیا گیا ہو، مگر یہاں ایک ہی بات طے شدہ شکل میں سامنے آ گئی کہ کوئی بات خواہ وہ کتنی اسلامی یا جمہوری کیوں نہ ہو اور کتنی ہی کوئی تجویز عوام کے ساتھ بلند بانگ دعاوی پر پابند بنانے والی ہو اسے نہیں سنا جائے گا اور یہ شاید محض اس ڈر سے کہ اس طرح حزبِ اختلاف کو کریڈٹ نہ مل جائے۔ بہرحال بعد میں کہا گیا کہ یہ ترمیمات نامعقول تھیں۔ اور آئین سازی کے کام میں رکاوٹوں کی خاطر یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسمبلی میں پیش کردہ ترمیمات خاص طور سے حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب اور دیگر حضرات علماء و ارکان کی اسلامی ترمیمات کا ایک جائزہ لیں۔

آئین کا حصہ دوم بنیادی حقوق سے متعلق ہے۔ انسان کے بنیادی حقوق پر سب سے زیادہ زور اسلام

نے دیا ہے، مسلمان تو مسلمان غیر مسلم انسانوں کا تحفظ، غلاموں کے حقوق اور رعایات، یہاں تک کہ حیوانات تک کے حقوق اور مفادات کے جزئی سے جزئی احکام اسلامی قانون (فقہ اسلامی) میں موجود ہیں۔ اس بارہ میں نہ تو قوم اور وطن کی تمیز ہے، نہ رنگ و نسل اور امیر و غریب کا کوئی امتیاز اور نہ کسی قبائلی عصبیت کے نام پر امتیازات ہیں۔ مگر ہمارے ہاں بشمول ۷۳ء وغیرہ تمام دساتیر کے بنیادی حقوق کا موجودہ تصور ان مغربی اقوام سے مستعار لیا گیا ہے۔ جو دعویدار تو عالمی انسانی حقوق کا بنتے ہیں۔ مگر ان کے انسانی مجد و شرف کی ساری عمارت وطنی، قومی اور دوسرے امتیازات پر ہے۔ امریکہ جو حقوق انسانی کے منشور کا موجد کہلاتا ہے۔ وہاں آئے دن کالے اور گورے، قومی اور غیر قومی ملکی اور اجنبی کے نام سے جو انسانیت سوز ڈرامے کھیلے جاتے ہیں، کس پہ مخفی ہیں۔ فلوریڈا کی ریاست میں نصاب تعلیم تک میں گوروں اور کالوں کا امتیاز رکھا گیا ہے۔ امریکہ میں کسی سیاہ فام کو حبشی عورت یا سفید فام کو حبشی مرد سے نکاح کی اجازت نہیں۔ خواہ اس کے خون میں کسی سیاہ فام کے خون کا ۸/۱ حصہ کیوں شامل نہ ہو۔ تقریباً ۱۴ ریاستوں میں ریلوں، بسوں، ہسپتالوں، ٹیلیفون کے کمروں یہاں تک کہ عبادت گاہوں تک میں یہ نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ جاپان اور انگلینڈ کے شاہی گھرانے کے افراد عام انسانوں سے ایک الگ مخلوق سمجھے جاتے ہیں۔ انگلینڈ کے دستور میں یہ بات شامل ہے۔ کہ بادشاہ ہر قانون سے مستثنیٰ ہے۔

دوسری طرف اسلام ہے جس کی نگاہ میں ساری مخلوق خدا کا گھرانہ ہے۔ الخلق عیال اللہ۔ لیکن ہماری نگاہیں اس سب کچھ کے ہوتے ہوئے مغربی تہذیب سے مستعار بنیادی حقوق کے تصورات پر ٹھہرتی ہیں۔ اور مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر بنیادی حقوق کے نام سے آئین کی رہی سہی اسلامیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً موجودہ بنیادی حقوق میں جنس (مرد، عورت) اور مذہب کی تمیز کئے بغیر ہر قسم کی ملازمتوں میں مساوات یہاں تک کہ وہ عدالت کا چیف جسٹس بھی بن سکے۔ کلیدی مناصب بھی سنبھال سکے۔ عام مجالس اور مقامات میں داخلہ اور مرد و زن کا اختلاط، تقریر و تحریر کی آزادی کے نام پر اخلاق اور مذہبی اقدار سے بھی آزادی ہر شخص جو چاہے مذہب اختیار کرے مسلم اور غیر مسلم (اہل ذمہ) مرد و زن سب کو تمام شعبہ ہائے حیات میں ایک لاٹھی سے ہانکنا۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں اسلام کے عطا کردہ حقوق کی نفی کرتی ہیں۔ اور آگے چل کر اسلامی قانون کی کئی اہم دفعات اور تقاضوں کے نفاذ کے لئے سد راہ بن سکتی ہیں۔ مثلاً کوئی مسلمان اپنا مذہب تبدیل نہیں کر سکتا۔ ۲۔ اسلامی مملکت میں ارتداد اور اس کی تبلیغ کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ۳۔ غیر مسلموں پہ مخصوص

ٹیکس جزیہ لگانے کی گنجائش ہے ۔ ۴۔ غلامی کے بارہ میں مخصوص حالات میں جواز کی گنجائش ہے۔
۵۔ عورت حدود اور قصاص جیسے احکام میں جج نہیں ہو سکتی۔ ۶۔ نہ اس کی قضا کئی ایسے امور میں
معتبر ہے۔ ۷۔ نہ حدود اور قصاص میں اسکی شہادت معتبر ہے۔ ۸۔ نہ وہ کسی اسلامی سٹیٹ کی سربراہ
بن سکتی ہے۔ ۹۔ نہ کھلے بندوں مردوں کی تفریح گاہوں اور مخلوط اجتماعات میں آجا سکتی ہے۔ ۱۰۔
دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہے۔ ۱۱۔ غیر مسلم اور ذمی، قاضی اور جج نہیں بن سکتا۔
۱۲۔ نہ وہ اسلامی قانون سازی کرنے والے اداروں مقننہ یا دستور ساز اداروں کا رکن بن سکتا ہے
بالخصوص جبکہ اسمبلی کو اس امر کا پابند بنا دیا گیا ہو کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق قانون سازی
کرے گی۔ اور نافذ الوقت قوانین کو کتاب وسنت کے دائرہ میں لائے گی، تو کتاب وسنت
کی تشریح قوانین اسلامی کی ترتیب، کتاب وسنت کے مطالب کا تعین، اسلامی شرعی ضوابط
فوجداری و دیوانی کی تعبیر کسی مقننہ شرعیہ (اسمبلی) کے غیر مسلم ارکان کی رائے سے کیسے کرائی
جا سکتی ہے۔ ایک شخص جب اسلام کے اساسی معتقدات توحید، رسالت، شریعت کی
صداقتوں کا معترف نہ ہو تو اسے اسلام ان باتوں کی تشریح وتعبیر کا حق کب دے سکتا ہے۔ اور
درحقیقت ایسا کرنا غیر مسلم اقلیتوں سے زیادتی نہیں عین انصاف ہے۔ وہ اگر انہیں اپنے
عقیدہ، مذہب اور نظریہ کے خلاف قانون سازی کرنے پر مجبور کرتا تو یہ ظلم ہوتا۔ موجودہ
دستور کا مسودہ نہ صرف انہیں یہ حق دیتا ہے، بلکہ حلف وفاداری وغیرہ کے رسمی الفاظ میں
ان سے اسلامی نظریہ کی بقاء وتحفظ کا حلف دلوا کر انہیں نفاق پر مجبور کرتا ہے۔ اور گویا بالجبر اس
ضمیر کشی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ الغرض اسلام غیر مسلموں کو تجارتی، انتظامی، صنعتی، اقتصادی وغیرہ
امور میں تو شریک کراتا ہے۔ مگر آئین اور قانون سازی کا حق کبھی نہیں دیتا۔ جو اجتماعی طور پر ——

تفقین القول علی الغیر —— ہے۔

۱۳۔ اور جب انہیں کسی انفرادی معاملہ میں انفرادی طور پر مسلمانوں پر ولایت خاصہ نہیں
دی گئی۔ تو پورے اسلامی سٹیٹ پر ولایت عامہ کب دے سکتا ہے۔؟ جو تمام اہم کلیدی مناصب
کی شکل میں ہو، عدم اعتماد کرنے سے انہیں حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسلام ملازمتوں اور انتخابی
عہدوں میں ایسے بنیادی معاملات میں امتیاز ناگزیر سمجھتا ہے، جبکہ موجودہ بنیادی حقوق غیر مسلم اقوام (جو
مرتد بھی کہلاتی ہیں شامل ہیں) کو نہ صرف صدارت، وزارت، عدلیہ کی سربراہی افواج اسلامی کی
کمان تک کے مناصب بھی تفویض نہیں کئے گئے۔ ۱۴۔ اسلام کی نگاہ میں کلیدی مناصب پر فائز

ہونا تو بڑی بات ہے، کسی غیر مسلم شہری کی مسلمانوں کے خلاف شہادت بھی معتبر نہیں۔ اس بارہ میں صاف الفاظ موجود ہیں۔ لن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا۔ خدا نے کافروں کو مسلمانوں پر کسی معاملہ میں بالادستی نہیں دی۔ اور ارشاد خداوندی ہے: لا تتخذوا بطانۃ من دونکم لا یألونکم خبالا۔

الغرض آئین کے بنیادی حقوق نہ صرف ان تمام باتوں کی نفی کر رہے تھے۔ بلکہ دفعہ ۸ ذیل ۱ کی تعلیم تو اس حصے کو قرآن و سنت تک پر بالادستی دے رہی ہے۔ کہ کوئی قانون یا کوئی رسم و رواج جو بمنزلہ قانون ہو اس باب میں عطاکردہ حقوق سے تناقض کی حد تک کالعدم ہوگا۔ بہرحال بنیادی حقوق کو اسلامی قانون سازی سے ہمکنار کرنے اور ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے ارکان اسمبلی کی طرف سے بے شمار ترامیم آئیں، اور حکومتی پارٹی کے جذبۂ مفاہمت، معقولیت اور حقائق پسندی کے دعووں کے باوجود ان کا جو حشر ہوا سب کے سامنے ہے۔

دفعہ ۱: اس دفعہ کا تعلق ملک کے نام اور علاقائی حدود کے تعین کے بارہ میں تھا۔ اکثر ترامیم اس میں مشرقی پاکستان کو شامل کرنے کی تھیں مگر حکومت کی پوزیشن اس معاملہ میں "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" کی سی ہے۔ اس لئے ان ترامیم کو زیر بحث ہی نہ لانے کے لئے ایک ترمیمی بل کے ذریعہ اس دفعہ پر بحث ملتوی کر دی گئی۔ حزب اختلاف نے نہ صرف اس پر شدید احتجاج کیا بلکہ ایوان سے کچھ دیر کے لئے بائیکاٹ بھی کیا۔

دفعہ ۲: دفعہ ۲ میں کہا گیا ہے کہ اسلام پاکستان کا مملکتی مذہب ہوگا۔ لازمی بات تھی کہ اب اس کے کچھ تقاضے ہوں گے، اور کچھ تقاضے، اگر آئین میں اسے ملحوظ نہیں رکھا جاتا تو یہ ایک مہمل عنوان بن کر رہ جاتا۔ مذہب تو انسانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور کسی مملکت کو اس کا پابند بنانے کا مقصد درحقیقت زندگی کے تمام شعبوں کو اس دائرہ میں لانا ہوتا ہے۔ نہ کہ کوئی خوشنما لیبل لگا کر اندر کی متضاد چیزوں کی ماہیتیں بھی بدل جائیں۔ اس دفعہ کی اہمیت کے پیش نظر بیشتر اہم ترامیم سامنے آئیں۔ پی پی پی کے پیر حسین جری اور نوجوان باغی عبد احمد رضا خان قصوری کی ترمیم تھی کہ اس دفعہ میں یہ اضافہ مزید ہے کہ رسم و رواج اس تناقض کی حد تک کالعدم ہوگا۔ جو اس آئین میں قرآن و سنت سے کہیں پایا جاتا ہے (ترمیم ۳۲) مولانا غلام غوث ہزاروی چاہتے تھے کہ اب جو شخص بھی اسلام کے قطعی احکام کی خلاف ورزی کرے تو سزا کا مستوجب ہوگا۔ مولانا عبدالحکیم کی تحریک تھی کہ اب مملکت اپنے سرکاری مذہب کے تحفظ کی ذمہ دار ہوگی۔ پی پی پی کے ۱۰ باغی

ممبر عبد الحمید جتوئی، مولانا ظفر احمد انصاری، جناب محمود الٰہی، جناب شاہ احمد نورانی، جناب پروفیسر غفور احمد، جناب شوکت حیات، نواب، جناب شیر باز خان مزاری، مولانا صدر الشہید وغیرہ کی ترامیم میں بھی مذہب کو تحفظ دینے، خلافت اسلامیہ، قانون سازی نہ ہونے اور تمام تعلیمات اور اس دفعہ کے متعلقات پیش کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ مولانا مفتی محمود صاحب اور دیگر ارکان جمعیت کے ساتھ شیخ الحدیث مولانا عبد الحق صاحب کی مشترکہ ترمیم ۳۵ یہ تھی کہ مسودہ آئین کی دفعہ ۴۲ میں اضافے بھی کئے جائیں کہ مملکت ضمانت دے گی کہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں رکاوٹ پیدا کرنے والا کوئی قانون یا پالیسی وضع نہیں کی جائے گی۔ کلیدی مناصب پر صرف مسلمان فائز ہوں گے۔ کسی مسلمان کو مرتد ہونے کی اجازت نہیں ہوگی۔ مگر آج دوسری خونریزی کا پہلا تجربہ تھا۔ ترامیم پیش کرنے والوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اتنی بے دردی سے ایسی اہم ترامیم کا خون ہوگا۔ دفعہ ۴۱ پر بحث کی اجازت نہ ملنے پر جب حزب اختلاف نے واک آؤٹ کیا، تو ابھی یہ لوگ لابی میں بھی نہیں پہنچ سکے تھے کہ سپیکر صاحب نے دفعہ ۴۲ کی ترامیم پیش کرنے والوں کے نام اتنی تیزی سے پڑھنے شروع کئے کہ ایوان میں بیٹھے ہوئے بعض اراکین بھی اس تیزی کی زد میں آ گئے۔ اور کہا گیا کہ ترمیمیں ساقط ہو گئیں۔ ان ارکان نے واپس آ کر احتجاج شروع کیا کہ ایسی ترامیم کا اس طرح سے خون کرنا بے انصافی ہے۔ مگر ان کا سارا واویلا صدا بصحرا ثابت ہوا۔ ہمارے دوست مولانا غلام غوث صاحب جو ایسے مواقع پر واک آؤٹ کو ترجیح دینے کے بجائے اکثر ایوان ہی میں موجود رہتے تھے۔ مگر آج انہیں بھی اس کا صلہ ملا۔ اور ایوان میں بیٹھے ہوئے اپنی ترمیم سے محروم ہو گئے۔

حزب اختلاف والے سنبھلے بھی نہ تھے کہ ساقط ہو جانے والی ترامیم اکتالیسویں نمبر پہنچ گئی تھیں۔ یہ مشترکہ ترمیم تھی جسے مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے پیش کیا اس پر محمود علی قصوری، ظفر احمد انصاری، شوکت حیات صاحب اور احمد رضا صاحب نے تقریریں کیں۔ دوسری ترمیم مولانا عبد المصطفیٰ الازہری نے پیش کی۔ اس پر بھی مفتی محمود صاحب، مولانا ہزاروی، محمود اعظم فاروقی، انصاری صاحب نے تقریریں کیں۔ اور آج کے اس طرز عمل پر احتجاج کرتے ہوئے اس تشویش کا اظہار کیا کہ ہمارے ساتھ کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اور یہ اتنی شاید کہ دفعہ ۴۲ قریب نظر کے سامنے تھی۔ مگر اسے آئین سے واقعی خدشہ کی حفاظت شامل کرنے سے کہا کہ ضرورت نہیں یہ دفعہ رکھی گئی ہے۔ تو اس کے تقاضوں کی رعایت بھی ضروری سمجھی گئی ہے۔ کئی اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کا حوالہ دیا گیا۔ مثلاً ایران کا سرکاری مذہب اثنا عشری ہوگا۔ بادشاہ کا مسلمان ہونا ضروری ہوگا۔ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جا سکتا۔

جو اسلام کے مقدس اصولوں کے منافی ہو! افغانستان کا مذہب اسلام اور بادشاہ حنفی العقیدہ ہوگا۔ عراق، شام اور اردن کی مثالیں بھی دی گئیں۔ غیر مسلم ممالک میں سپین، ناروے، سویڈن و ہالینڈ وغیرہ کے حوالے دیئے گئے کہ وہاں کسی غیر سرکاری مذہب والوں کو تعلیم و تبلیغ کی اجازت نہیں۔ اسلامی ممالک میں کسی غیر اسلامی قانون کے چل سکنے کا تصور تک بھی نہیں تھا۔ یہاں سنہ ۱۸۶۴ء (انگریزوں کے تسلط) کے بعد ہی ایسی باتیں شروع ہوئیں۔ در اصل اس دفعہ اور آگے اکثر ترمیمات کا زیادہ تر مقصد یہ تھا کہ آئین کی دفعہ ۲۲۷ میں قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی کے لئے مجوزہ غیر موثر طریق کار کسی طرح موثر بنا دیا جائے۔ جس کا حوالہ بڑے زور و شور سے حزب اقتدار کی طرف سے دیا جاتا رہا۔ اور جب مشاورتی کونسل کے موثر بنانے کی بات ہوئی۔ تو ایوان کی بالادستی مجروح ہونے کا عذر پیش کیا جاتا۔ اس کے جواب میں بار بار کہا گیا کہ اگر اسے عدالت عالیہ یا سپریم کورٹ میں چیلنج کی جانے والی دیگر تمام دفعات میں شامل کر لیا جاتے۔ تو ہر دفعہ میں اسلامی تحفظات پر مبنی ترمیمات پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن اگر دیگر قوانین میں عدالت اعلیٰ کے فیصلوں کو کالعدم کر سکتی ہے تو اسلامی دفعات کے بارہ میں یہ بالادستی قائم رکھنا کیوں ضروری ہے۔ اور معقول بات تو ایسی ترمیمات سے چھوٹنے کے جواب میں یہ تھی کہ جس طرح قانون سازی اسلام کے دائرہ میں ضروری ہے۔ اسی طرح آئین کی تمام دفعات کو بھی اسلامی دائرہ میں لانے کی خاطر علماء کی ترمیمات کا پیش کرنا ایک فریضہ ہے۔

بہرحال رائے شماری ہوئی، اور مغربی جمہوریت کی کافرانہ کرشمہ کاریوں کا ظہور ہونے لگا۔ ۲۰، ۲۵ افراد کی اقلیت کیا کر سکتی ہے۔ اس میں بھی دو چار ادھر ادھر کھسک جاتے۔ پیپلز پارٹی کے چار پانچ جمہوری اور غیور افراد کو چھوڑ کر باقی تمام ٹیم قائد ایوان کے ایک اشارہ کے منتظر ہوتے اور مخالفانہ رائے سے ایسی ترمیمات مسترد کر دیتے۔ قیوم صاحب کے ارکان بھی جنہوں نے اسلام کی خاطر اور سوشلزم کے مقابلہ کے نام پر انتخاب میں حصہ لیا تھا، آنکھیں بند کئے حزب اقتدار کے ہمنوا رہتے۔ اور تعجب تو قبائلی ارکان پر رہا، جو اپنے علاقوں سے نامزد کئے گئے، جن کی غیرت ایمانی اور اسلامی احساسات بہت تیز ہیں۔ بہرحال ہم نے ترمیمات کے بعد آئین کے ابتداء اور آخر میں سے پہلے آئین کے سلسلہ میں اظہار حق کا ساتھ دینے کے لئے اظہار رائے کئے تھے۔ مگر آئین سازی کے بارہ میں اسلامی ترامیم سے اہم کام بھی آخر تک بھی ہوتے رہے۔ اخبارات میں بہت لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ترمیم کیا ہے، اور اسکی تذکرہ کیوں نہیں ہو سکتی ہے ۔۔۔ بہرحال ترمیمات مسترد ہوتی چلی گئیں اور دوسرے

دن اسی دفعہ میں شیخ رشید نائب قائد ایوان کی ترمیم سامنے آئی، کھٹکا تو پہلی خواندگی کے دوران ان کی اس تقریر سے ہو گیا تھا جس میں انہوں نے قیام پاکستان کو معاشی عوامل پر مبنی قرار دیدیا تھا آج ان کی ترمیم یہ تھی کہ پاکستان کی معیشت کی بنیاد سوشلزم پر ہوگی۔ استحصال کے خاتمے کے لئے ہر شہری سے اس کی اہلیت کے مطابق کام اور ہر ایک کو اس کام کے مطابق معاوضہ ــــ تحریک سامنے آ گئی، اسلامی درد رکھنے والوں کے دل ڈوب گئے کہ ادھر مذہب کو سرکاری مملکت بنانے کی دفعہ اور اب مسجد کے زیر سایہ خرابات کی یہ المناک مثال، مخالفت میں زور شور سے تقریریں ہوئیں۔ مولانا ہزاروی، مولانا انصاری وغیرہ نے کہا کہ یہ ترمیم تو دیباچہ اور تمہید کی نفی ہے۔ پھر سوشلزم کی تعریف اور مفہوم پر کبھی کا اتفاق ہو سکا ہے۔ ایسی مبہم چیز کو آئین میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ مفتی محمود صاحب نے کہا کہ کیا اسلام ایک مکمل نظام سیاست نہیں۔ مولانا عبدالحق صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ نفاق کا یہ راستہ دنیا میں ہمیں رسوا کر دے گا۔ یہ ترمیم حلف وفاداری سے غداری ہے۔ اور خود دفعہ ۲ کالعدم کر دیتی ہے۔ اسلام صرف عبادات کا نام نہیں، مکمل عادلانہ نظام حیات ہے۔ نہ سوشلزم نہ سرمایہ داری، نہ کمیونزم، انہوں نے ان ازموں کے بغیر اسلامی دور عروج کی خوشحالی کا ذکر کیا۔ اکثریت کی تعداد سر پر لٹکتی دیکھ کر حزب اختلاف نے حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ اور اس ترمیم کی جگہ کچھ ترمیمیں ایسی پیش کیں۔ کہ کسی طرح سوشلزم کو اپنے کافرانہ فلسفہ سے الگ کرا دیا جائے۔ سوشل جسٹس، اسلامی مساوات، اسلامی سوشلزم اور مساوات محمدی کے الفاظ پیش کئے گئے۔ زوردار تقریریں ہوئیں۔ علماء حق نے اسکی بھی مخالفت کی۔

مولانا عبدالحق صاحب نے کہا کہ سوشلزم کے ساتھ اسلامی دم لگانا اور آئین میں رکھنے سے بگاڑ دینا ایسا ہے۔ کہ کنوئیں میں ایک قطرہ پیشاب سارا پانی ناپاک کر دے۔ اور اگر یہ اصطلاح چل نکلی تو آگے اسلامی شراب، اسلامی جوا، اسلامی زنا بھی رواج پا سکے گا۔

پی پی پی کی خاتون رکن نسیم جہاں بھی ایسے موقع پر بعض اسلامی ممالک کا ذکر کرنے لگتی ہیں۔ اور وہاں کے علماء سے یہاں کے علماء کا موازنہ کہ وہ بھی علماء ہیں۔ مگر وسیع النظر، اور یہاں کے اہل علم تنگ نظر ہیں۔ اس کے جواب میں کہا جاتا کہ اصل آئیڈیل قرآن و سنت ہے۔ نہ کہ دیگر ممالک مگر نقار خانے میں طوطے کی صدا کون سنتا ہے ــــ بہر حال بحث کے دوران مولانا کوثر نیازی صاحب کی ایک ترمیم سامنے آ گئی، کہ معیشت کی بنیاد اسلامی سوشلزم پر ہوگی۔ جو مساوات محمدی کا آئینہ دار ہوگا۔ جو سب وقتی فائدہ تو اسلام اور سوشلزم دونوں کو خوش کر کے ممدوح الطرفین بننا ہی تھا۔ وہ

اگر چاہتے تو اس ترمیم کے بغیر بھی شیخ رشید کی ترمیم منظور کر سکتے تھے۔ مگر یہ بھی غنیمت ہے کہ اس وقت شیخ رشید کی خالص سوشلزم پر مبنی ترمیم اس ترمیم کے بغیر منظور نہ ہو سکی۔ مگر آئین کی اسلامی حیثیت کو بہرحال مشکوک اور مجروح بنا دیا گیا۔ اس ترمیم پر بحث اور حزب اقتدار کی تقاریر سے "اسلامی آئین سازی" کے بارہ میں سرکاری پارٹی کا طرز عمل اور انداز فکر اور بھی نمایاں ہو کر سامنے آنے لگا۔ اگلی تمام دفعات پر بھی بیشمار ترامیم سامنے آتی رہیں۔ اور اکثریت کی ایک ہی ضرب سے امت مسلمہ کی امیدیں جمہوریت پسند عوام کے ولولوں اور تاریخ کی بے مثال قربانیوں کا خون کر کے خاک میں ملا دی جاتیں۔

تا دم تحریر ایک ہزار سے زاید ترمیمات اپنی معقولیت کا لوہا منوانے کے باوجود مسترد ہو چکی ہیں، سوائے دو چار لفظی ترامیم کے جن کا تعلق زبان کی اصلاح تک محدود رہا۔ ایسی اصلاح بھی صرف پی پی پی کی قبول کی گئی ان ترمیمات پر جو بحث و مباحثہ ہوتا رہا اسکی تفصیلات کی کچھ معمولی جھلکیاں اخبارات میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ تاریخ نے بھی اسے اپنے سینے میں محفوظ کر لیا۔ فیصلہ آنے والوں کے ہاتھ میں ہوگا۔

حزب اقتدار ان ترمیمات کو آئین سازی کی راہ میں رکاوٹ سے تعبیر کرتی ہے مگر فیصلہ تاریخ کے ہاتھ میں ہے۔ اس فیصلہ کو ہم مسودہ اور ترامیم کا موازنہ کر کے آج بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ تاریخ پوچھے گی کہ حزب اقتدار اگر متعصب اور غیر مخلص تھی۔ تو آزاد ارکان کی ترامیم کا کیا حشر ہوا۔ اسے بھی چھوڑ کر پی پی کے چند باضمیر افراد نے جمہوریت، اسلامی تہذیب اور معاشرہ کے قیام پر مبنی ترامیم پیش کیں، ان کا کیا حشر ہوا۔ اور کیوں عین موقع پر انہیں اپنی ترامیم واپس لینی پڑتیں۔ تاریخ ان گنی چنی ترامیم کا بھی جائزہ لے گی، جنہیں منظور کرنے کی پیشی بڑے زور شور سے کی جاتی۔ مگر جن میں سوائے لفظی اصلاحات، اور تذکیر و تانیث کے ہیر پھیر کے اور کچھ نہ ہوتا۔

ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں۔ کہ تمام پیش کردہ ترامیم اسکی تحریک کرنے والوں کی تقریریں اور حزب اقتدار کی جوابی تقریریں اور رد عمل پر تفصیلی روشنی ڈال سکیں، البتہ کوشش کریں گے کہ اسلامی جمہوری اور عوامی فلاح و بہبود کے متعلق اہم ترامیم کا کچھ نہ کچھ ذکر ہو جائے ——

جمعیۃ علماء اسلام کے دیگر اکابرین کے علاوہ ہر اہم موقع پر شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ نے بھی تقریباً ایک سو ترمیمیں داخل کیں۔ جہاں ان کی ترمیم ہے۔ تو اس کو بنیاد بنا کر اس کے مترادف ترامیم کو اجمالاً اشارہ کریں گے۔ اسی طرح جمعیت علمائے اسلام کی مشترکہ ترامیم کا بھی ذکر

آتا رہے گا۔ اور ساتھ ساتھ دیگر جماعتوں اور آزاد اراکین کی ترمیمات کا بھی ذکر ہوگا، ترامیم کے الفاظ کو قوسین [ ] میں نمایاں کیا گیا ہے۔ ترمیم پر بحث و مباحثہ اسمبلی کے دیئے گئے نمبرات کے مطابق ہو رہا تھا اسی نمبر سے اسمبلی کے ریکارڈ پر ترمیم آتی اس لئے اسمبلی کے دیئے ہوئے نمبرات کے ساتھ ترامیم درج کئے جائیں گے۔

دفعہ ۳ | دفعات ۱ اور ۲ کا اجمالاً ذکر آچکا ہے۔ ۳ کا تعلق افراد کے ساتھ قانون وغیرہ کے مطابق سلوک کرنے اور کسی ایسے کام پر مجبور نہ کرنے سے ہے جس کے کرنے کا قانون متقاضی نہ ہو اور نہ ایسے افعال میں مزاحمت ہوگی، جو قانوناً ممنوع نہ ہو۔ مولانا عبدالحکیم کی ترمیم تھی کہ ان دفعات کو قرآن و سنت سے مشروط کیا جائے اگر قرآن و سنت کسی سے تقاضا کرتا ہے۔ تو اسے مجبور کیا جاسکتا ہے ورنہ نہیں۔

دفعہ ۴ | مملکت کے آئین سے وفاداری اور قانون کی اطاعت کے بارہ میں ہے۔ مولانا ظفر احمد انصاری آزاد رکن نے کہا، شرط یہ ہے کہ (اس طرح قرآن و سنت کے مسلمہ احکام کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو) سردار شوکت حیات، نورانی صاحب وغیرہ کی مشترکہ ترمیم یہ تھی (کہ قانون انفرادی حقوق کی کسی خلاف ورزی کو عدالت میں زیر غور لائے جانے سے مستثنیٰ نہیں کرے گا۔)

دفعہ ۵ | یہ ہے کہ آئین کی تنسیخ یا اسکی سعی یا سازش سنگین غداری ہے۔ مولانا ظفر احمد انصاری، محمود علی قصوری، احمد رضا صاحب، چوہدری ظہور الٰہی صاحب وغیرہ کی ترمیمیں یہ تھیں۔ کہ ایسی سرگرمیاں بھی اس کی زد میں آنی چاہئیں، جو بالآخر ملک کی سالمیت ختم کرنے یا ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر منتج ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح اس دفعہ کو صدر یحییٰ کے دور کے لئے مؤثر بہ ماضی بنانا چاہئے۔ انصاری صاحب نے کہا، کہ مشرقی پاکستان کا المیہ یکایک نہیں ۱۹۶۵ء کے بعد تمام حالات کا پیدا کردہ ہے۔ تو اصل مسئلہ آئین توڑنا نہیں، بلکہ ملک توڑنا ہے۔ مگر یہاں تو ۱۹۶۹ء سے قبل کئے گئے تمام اقدامات کو دفعہ ۲۷۰ میں تحفظ دیکر یحییٰ خان کو تحفظ دیا گیا ہے۔ حالانکہ دستور ایک دن میں توڑا گیا۔ مگر پورے سال کی سازشوں کا نتیجہ ملک، توڑنے کی شکل میں نکلا۔ ظہور الٰہی صاحب نے کہا کہ وزیر یا مشیر جس شکل میں بھی یحییٰ جیسے آمروں کی مدد کرتے رہے۔ انہیں بھی آئین میں غدار قرار دینے کی گنجائش رکھی جائے۔ مفتی محمود صاحب نے بھی ایسے خیالات کا اظہار کیا۔ سرکاری ارکان نے مخالفت کی۔

دفعہ ۶ | اس کا تعلق بنیادی حقوق کے منافی قوانین کالعدم ہونے سے ہے۔ مولانا عبدالحق مدظلہ

کی رائے میں قرآن وسنت کو بنیادی حقوق کا معیار بنانا ضروری تھا، نہ کہ خود بنیادی حقوق کو۔ اس لئے ان کی ترمیم ۳۳ یہ تھی کہ (الا یہ کہ ایسا قانون، رسم ورواج جو قرآن پاک اور سنت کے مطابق ہو) مولانا عبدالحق کی ترمیم ۳۶ بھی بنیادی حقوق کو اصولاً اسلام کے دائرہ میں لانے کی غرض سے تھی۔ جس میں کہا گیا تھا۔ (کہ دفعہ ۸ کی شق ۲ کے بعد حسب ذیل نئی شق کا اضافہ کیا جائے کہ ---

(۳۔ الف اس باب کا کوئی حکم، امر، قرآن پاک اور سنت کے مطابق قانون سازی میں مانع نہیں ہوگا۔)

اس دفعہ کے ذیلی پیراگراف میں مسلح افواج یا پولیس یا امن عامہ کے ذمہ دار دیگر جمعیتوں کو اس دفعہ کے اطلاق سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ احمد رضا قصوری، نورانی صاحب، شوکت حیات، پروفیسر غفور احمد صاحب، مزاری صاحب کی ترمیم یہ تھی کہ اس کا تعین کرنا پارلیمنٹ کا کام ہونا چاہیئے۔ سردار مولا بخش سومرو، احمد رضا، ڈاکٹر خورشید علی وغیرہ نیز مولانا مفتی محمود، مولانا عبدالحق اور دیگر ارکان جمعیۃ کی ترمیم ۴۷ یہ تھی۔ کہ اس پیرا سے پولیس یا امن عامہ قائم رکھنے والے ادارے حذف کئے جائیں۔ دفعہ ۸ کی شق ۳ کا پیرا (ب) آئین کے جدول اول کے احکام کو اس دفعہ سے تحفظ دینے کی غرض سے ہے۔ جدول اول مارشل لاء کے جاری کردہ آرڈیننس پر مشتمل ہے۔ اور ایسے فرامین بھی جو نفاذ آئین سے قبل صدر ایوب، صدر یحییٰ اور خود صدر بھٹو کے زمانہ میں نافذ ہوئے جنہیں پارلیمنٹ کی منظوری حاصل نہیں ہوئی۔ ان میں فیملی لاء جیسے رسوائے زمانہ آرڈیننس بھی ہیں۔ ایک جمہوری اور پارلیمانی نظام قائم ہو جانے کے فوراً بعد ایسے کالے قوانین کالعدم ہونے چاہئیں۔ ایسا نہ ہوسکے تو جدول اول کے تمام قوانین کو بھی اسمبلی میں پیش کرنا تھا۔ یہ بھی نہ ہو سکتا۔ تو اسے بنیادی حقوق کی اس دفعہ کے تحت لانا چاہیئے تھا۔ جو متناقض ہوتے خود بخود کالعدم ہو جاتے، مگر یہاں ستم بالائے ستم یہ ہوا۔ کہ دفعہ ۸ میں ایک ذیلی شق بڑھا کر جدول اول کو شقات (۱) اور (۲) سے مستثنیٰ قرار دیکر تحفظ دیا گیا۔

اس غرض سے مولانا عبدالحق، مولانا ظفر احمد انصاری، سردار سومرو، احمد رضا قصوری، مولانا نورانی، محمود علی قصوری، امیرزادہ خان وغیرہ کی ترمیمیں یہ تھیں کہ (دفعہ ۸ ذیلی ۳ شق ب کو حذف کر دیا جائے۔) اس دفعہ کی شق میں کہا گیا ہے۔ کہ آئین میں اگر تصریح ہو تو بنیادی حقوق معطل کئے جا سکتے ہیں۔ اس پر بھی کئی ترمیمیں آئیں --- ان حقوق کے تعطل کے سلسلہ گوناگوں تخصیصات اور استثنیات کے خلاف حزب اقتدار نے احتجاج کیا۔ محمود علی قصوری نے کہا۔ کہ بنیادی حقوق کھانے کا ایک

طریقہ یہ ہے کہ استثنیٰ کی ایک لمبی فہرست لگادی جائے۔ انصاری صاحب نے کہا کہ ان حقوق کا تعطل جنگ کے علاوہ کبھی نہیں ہونا چاہئے۔ مفتی محمود صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب نے کہا کہ بنیادی حقوق سے تصادم پر رسم ورواج اور قانون کالعدم ہوسکتا ہے۔ تو کتاب وسنّت کے منافی قوانین کالعدم ہوجانے کی دفعہ بھی اس باب میں رکھی جائے۔ ظہور الٰہی صاحب نے کہا کہ اس دفعہ کی شق ۲ سے قرآن وسنت کے دئیے گئے حقوق چھین سکتی ہے۔ اس دفعہ کی تمام ترامیم مسترد ہوئیں۔ اور احتجاجاً حزب اختلاف کو واک آؤٹ کرنا پڑا۔

دفعہ ۹ گرفتاری اور نظربندی کے تحفظ کے عنوان سے امتناعی نظربندی کا جواز بھی اس سے مہیا ہورہا تھا۔ بہت سے ارکان نے ترامیم میں ایسی شقات حذف کرنے پر زور دیا تھا مفتی محمود صاحب کی مشترکہ ترمیمات میں بعض تشریحی اور اضافی چیزیں بھی شامل تھیں۔ اور شق ۵ کے الفاظ آٹھ اور بارہ کو چھ اور آٹھ سے بدلنے کا کہا گیا تھا۔ دیگر ارکان کے علاوہ علی احمد تالپور، عبدالخالق خان، میر غوث بخش بزنجو، عبدالحمید جتوئی وغیرہ کی بھی ترمیمیں تھیں۔ اور مختلف پیرایوں میں یہ سعی کی گئی تھی کہ یہ دفعہ ہر فرد کو واقعی معنوں میں گرفتاری نظربندی اور بے جا تشدد سے تحفظ دے سکے۔ مگر کوئی ترمیم منظور نہ ہوسکی۔

دفعہ ۱۱ اس کا تعلق غلامی بیگار وغیرہ امور سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو غلام نہیں بنایا جائیگا۔ اور کوئی قانون غلامی کو کسی صورت میں رواج دینے کی اجازت نہیں دے گا۔۔۔۔ الخ غلامی کے بارہ میں اسلام نے جو نہایت عادلانہ اور حکیمانہ نقطہ نظر اختیار کیا۔ اغیار بھی اس کے قائل ہیں۔ اسلام نے نہ تو غلامی کو فرض ٹھہرایا۔ نہ اس کی ترویج پر زور دیا۔ خاص جنگی حالات اور مقاصد کے پیش نظر اباحت کے درجہ میں بہرحال گنجائش موجود ہے۔ یہ دفعہ خیر القرون کے پورے دور کا مقابلہ پھر کتاب وسنّت اور فقہ اسلامی کے تمام مکاتب میں موجود ذخیرہ احکام پر یک جنبش قلم پانی پھیر رہا تھا۔ اور شرعی حکم کا اظہار بہرحال ضروری تھا۔ اس لئے مولانا عبدالحق مدظلہ نے ترمیم ۱۱ پیش کی تھی کہ کسی بھی (شہری) کو غلام نہیں بنایا جائے گا۔ اور کوئی قانون (سوائے اسلامی احکام کے تابع اجازتوں کے) پاکستان میں۔۔۔۔۔ الخ) مولانا غلام غوث کی الگ اور مفتی محمود صاحب کی مشترکہ ترمیم بھی اس دفعہ کی اصلاح سے متعلق تھی۔ اور سب ترامیم بحث کے بعد مسترد ہوگئیں۔

دفعہ ۱۳ میں یہ تسلیم تھی کہ کسی شخص کو نہ صرف شہادت حاصل کرنے کی غرض سے بلکہ کسی شکل میں ایذاء نہیں دی جائے گی۔ چاہے وہ ثبوت کے طور پر ہو یا سزا کے طور پر۔ نہ اس کیساتھ

غیر آبرو مندانہ، ظالمانہ یا غیر انسانی سلوک روا رکھا جائے گا۔

دفعہ ۱۵ میں یہ ترمیمیں تھیں کہ ہر شہری کو نہ صرف پاکستان میں نقل و حرکت کی آزادی ہو بلکہ ہر شہری کو پاسپورٹ حاصل کرنے اور ملک سے باہر جانے اور آنے کا حق ہوگا۔ پیر غوث بخش بزنجو، امیر زادہ خان، خان عبدالولی خان، محمود علی قصوری وغیرہ نے پاسپورٹ کی آزادی اور سہولتوں پر تقریریں بھی کیں۔ مگر کوئی ترمیم قبول نہ کی گئی۔

دفعہ ۱۶ انجمن سازی اور سیاسی جماعتوں کی رکنیت کے حق کے بارہ میں ہے۔ مفتی محمود، مولانا عبدالحق، مولانا صدر الشہید، مولانا نعمت اللہ وغیرہ ارکان کی مشترکہ ترمیم نمبر ۲۱ یہ تھی کہ (یہ حق سرکاری ملازم نہ ہونے سے مشروط کرنا چاہئے۔) مولانا عبدالحکیم نے اپنی ترمیم میں (اخلاق اور مفاد عامہ کے ساتھ اسلام کے مسلّمہ احکام بڑھانے) کا ذکر کیا تھا۔ نورانی صاحب، شوکت حیات، پروفیسر غفور اور مزاری صاحب کی مشترکہ ترمیم میں تھا۔ (کہ ایسی یونین یا انجمن بنانے پر پابندی ہو۔ جس کا پروگرام اور عمل پاکستان کی سالمیت اور نظریئے کے خلاف ہو۔) محمود علی قصوری کی ترمیم تھی کہ کارکنوں کو ٹریڈ یونین بنانے اور معقول اجرتوں کے تعین کیلئے اجتماعی مذاکرات کے حق کی ضمانت ملنی چاہئے۔) مگر ان میں سے کوئی بھی ترمیم شرف قبول نہ پا سکی۔

دفعہ ۱۷ اس کا تعلق تجارت کاروبار اور پیشوں کی آزادی سے متعلق تھا۔ مذکورہ ارکان جمعیۃ کی ترمیم نمبر ۲۲ یہ تھی۔ کہ (ایسے تمام پیشوں یا کاروبار کو اسلام کے احکام کے تابع ہونا چاہئے۔) اس پر زور دار بحث ہوئی۔ مولانا مفتی محمود، مولانا عبدالحق، مولانا ہزاروی وغیرہ نے تقریریں کیں۔ کہ حکومت کو حلال و حرام کاروبار میں تمیز کرنی پڑے گی۔ اور سودی کاروبار، گھوڑ دوڑ، شراب، زنا کے پرمٹوں پر پابندی لگانی ہوگی۔ مگر خورشید حسن میر کہہ رہے تھے۔ کہ علماء حلال و حرام کے بارہ میں بھی متفق نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے علماء سے پوچھنے کی بجائے ہم حلال و حرام کی اس تمیز میں نہ پڑیں۔ مفتی محمود نے کہا کہ اگر آپ کو اسلام سے جان خلاصی کرنا ہے۔ تو صاف صاف اعلان کر دیں۔ کہ یہ ایک لادینی سیکولر سٹیٹ ہے۔ ورنہ یہاں تو حلال و حرام کے مسائل چھیڑیں گے۔ معلوم جب ہوگا ہمیں اجارہ متعین کرنا ہوگا۔

مولانا ہزاروی کی ترمیم اس دفعہ کی شق نمبر ۳ میں یہ تھی کہ (ایسی تعلیم کسی دوسرے فرقہ کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کرے) مولانا نے کہا کہ فرقہ وارانہ باتوں کو روکنا حکومت کا فرض ہے۔ پیرزادہ صاحب نے ان ترامیم کے جواب میں کہا کہ قانون کے تحت مذہبی طبقوں کو سکول کھولنے کا حق دیا گیا ہے۔ آئین میں مکمل نہیں، تو قانون میں یہ حق مکمل شکل میں دیا جائے گا۔ مولانا ہزاروی نے اس یقین دہانی پر اپنی ترمیم واپس لے لی مگر مولانا

عبدالحق صاحب نے واپس نہیں لی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ آئین میں واضح طور پر یہ ضمانت ملنی چاہیئے۔ کہ مسلم تعلیمی اداروں میں تمام لادینی سرگرمیوں اور کمیونزم، قادیانیت، مسیحیت، الحاد اور مغربیت کی روک تھام کی جا سکے۔ اور مشنری ادارے اس صورت میں اپنے نظامِ تعلیم کو چلائیں۔ جب ان کے اداروں میں مسلمان بچے نہ ہوں۔

دفعہ ۱۸ کا تعلق تقریر وغیرہ کی آزادی سے ہے کہ پاکستان کی سالمیت دفاع امن عامہ وغیرہ کے تابع ہر شہری کا یہ بنیادی حق ہوگا۔ مولانا عبدالحق مدظلہ کی ترمیم ۲۲۶ یہ تھی۔ کہ ان مستثنیات میں (اسلام، نظریۂ پاکستان اور اکابرِ اسلام) کا بھی اضافہ کیا جائے۔ تاکہ کسی شہری کو بنیادی نظریۂ اسلام اور اکابرِ اسلام کی توہین کی اجازت نہ ہو۔ مولانا غلام غوث نے اپنی ترمیم ۲۲۴ میں "اسلام کی بے حرمتی" بڑھانے پر زور دیا تھا۔ مولانا عبدالحق کی ترمیم تو نظر انداز کر دی گئی۔ مگر اسلام کی بے حرمتی کا زہر بڑی آسانی سے نہیں نگلا جا سکتا تھا۔ اس لئے بڑی ہوشیاری سے منفی پہلو کو مثبت الفاظ "اسلام کی عظمت" سے بدلنے پر مولانا ہزاروی کو راضی کر کے یہ ترمیم قبول کر لی گئی۔ مولانا عبدالحکیم کی ترمیم ۲۲۷ بھی اس قسم کی تھی۔ محمود علی قصوری کی ترمیم میں پریس اخبارات وغیرہ کے حق پر بھی زور دیا گیا تھا۔

دفعہ ۱۹ کا تعلق ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اسکی تبلیغ کرنے سے متعلق تھا جو غیر مبہم طور پر ارتداد کی ممانعت نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ ایک حد تک تبلیغ ارتداد کی چھوٹ دے رہا تھا۔ اس پر بڑی گرماگرمی ہوئی۔ مفتی محمود کے ساتھ ارکانِ جمعیۃ کی مشترکہ ترمیم ۲۳۲ شاہ احمد نورانی شوکت حیات، پروفیسر غفور احمد، شیر باز مزاری کی مشترکہ ترمیم ۲۳۴ احمد رضا قصوری، مولانا انصاری وغیرہ کی ترامیم میں کہا گیا تھا۔ کہ مملکتی مذہب کا تقدس ملحوظ رکھا جائے۔ مرتد ہونا اور خلافِ اسلام تبلیغ کرنا ممنوع ہو۔ مولانا غلام غوث کی ترمیم ۲۲۳ میں ارتداد کی یہ تشریح بھی شامل تھی (مرتد وہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد قرآن کی کسی آیت یا رسول کی کسی متواتر حدیث یا ان کی اجماعی توضیح کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔) شیخ الحدیث مولانا عبدالحق کی ترمیم ۲۳۵ کے الفاظ یہ تھے۔ (لیکن الیاحق، انسداد ارتداد سے متعلق کسی قانون پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ بلکہ ایسے افکار و نظریات کی اشاعت پر پابندی عائد کی جا سکے گی۔ جو مملکت کے اسلامی اصولوں کے انہدام کے باعث ہوں۔)

دفعہ ۲۱ اس دفعہ کا تعلق مذہب وغیرہ کے بارے میں تعلیمی اداروں سے متعلق تحفظات سے متعلق تھا۔ مولانا عبدالحق مدظلہ کی ترمیم یہ تھی کہ (کسی تعلیمی ادارے میں) خلافِ اسلام تعلیم و تبلیغ کی

اجازت نہ ہوگی۔ الا یہ کہ وہ ادارہ غیر اسلامی فرقے کیلئے مختص ہو۔ اس میں مسلمان شہری تعلیم نہ پاتے ہوں۔)

دفعہ ۲۳ اس دفعہ کا تعلق جائیداد سے متعلق احکام سے تھا، کہا گیا تو یہ کہ ہر شہری کی جائیداد کا تحفظ کیا جائے گا۔ مگر آگے کئی شقات اور ذیلی دفعات میں یہ سب کچھ مستثنیات ہے۔ کہ حکومت اور پارلیمنٹ بلا روک ٹوک جب چاہے، جسطرح چاہے۔ جائیداد ضبط کر سکتا ہے۔ معاوضہ کا تعین کرے یا نہ کرے یا ملکیت کی تحدید کرے اور شہری کسی عدالت کا دروازہ بھی نہ کھٹکھٹا سکے۔ یہ دفعہ ایک ایسی سیف براں ہے جو ملک کے ہر امن پسند شہری کی املاک اور جائیداد پر لٹکتی رہے گی۔ اور ایک اسلامی سٹیٹ کے شہری ہمیشہ اپنی املاک کے بارہ میں احساس تحفظ سے محروم رہیں گے۔ نہ اس میں جائز اور ناجائز املاک کی تمیز ہے، نہ ظالمانہ استحصال اور غیر استحصال کی اس پر بہت سی ترامیم ہر مکتب فکر سے آئیں۔ خود سرکاری پارٹی کے ارکان سے بھی مولانا عبدالحق کی ترامیم ۲۶۰، ۲۶۳، ۲۶۲ میں دفعہ ۲۳ کی ذیلی دفعہ ۳ کی شق الف۔ ب۔ ج حذف کرنے سے متعلق تھیں، کیونکہ انکے ہوتے ہوئے جائیداد کے تحفظ سے متعلق دفعہ عملاً کالعدم کر دی گئی ہے۔

مفتی محمود اور اکابر جمعیۃ کی مشترکہ ترمیمیں مولانا انصاری، مولانا نورانی، چوہدری ظہور الٰہی، راؤ خورشید علی کی ترامیم بھی ان دفعات کو حذف کرنے سے متعلق تھیں۔ البتہ نیپ کے جناب امیر زادہ خان کی ترمیم یہ تھی، کہ جائیداد حاصل کرلینے کی صورت میں شہریوں میں امتیاز نہ برتا جائے۔ محمود علی قصوری کی ترمیم صرف دفعات کی ترتیب بدلنے سے متعلق تھی۔ نفس مضمون سے انہیں اتفاق تھا۔ شق ۳ کے پیرا (ب) کے آخر میں اضافہ کرانے کے بارہ میں مولانا عبدالحق مدظلہ کی ترمیم ۲۵۵ یہ تھی۔ کہ استثناء صرف اس صورت میں ہونا چاہیے کہ (کوئی قانون جو غیر اسلامی ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت یا جائیداد کو اس کے اصل مستحقین "جائز مالکان" کو واپس کرنے کے لئے وضع کیا جائے گا۔) مقصد یہ تھا کہ جبری ضبطی صرف حرام اور ظالمانہ دولتوں کی ہو سکتی ہے۔ وہ بھی بحق سرکار نہیں۔ بلکہ اصل حقداروں تک پہنچانے کی غرض سے ذیلی دفعات مالکان کو کسی عدالت عالیہ میں معاوضہ کے بارہ میں شکایت کا حق بھی چھین رہی ہیں۔ اس کے بارہ میں مولانا عبدالحق مدظلہ نے ترمیم ۲۶۳ داخل کرائی تھی۔ (کہ دفعہ ۲۳ کی شق ۴ کو حذف کر کے یہ شق بڑھا دی جائے کہ (۴) ذیلی شق ۲ کے تحت ادا کردہ کسی معاوضہ کے مناسب ہونے سے متعلق کسی تنازعہ کا فیصلہ عدالت عالیہ اپنے ابتدائی اختیارات سماعت کے تحت کرے گی۔) مگر جائیداد کی ضبطی کی یہ دفعہ ۲۳ بڑے جوش و خروش سے سرکاری پارٹی نے نہ صرف تالیوں کی گونج میں منظور کرالی۔ بلکہ جب آگے چل کر

شراب نوشی، جوا، قمار، زنا، فحاشی وغیرہ سے متعلق بھی اگر ترمیم آجاتی، تو سرکاری پارٹی کے بعض ترجمان اسے اسی دفعہ کو ان سب خرابیوں کے مداوا اور زہر کے تریاق کے طور پر پیش کرتے۔ کہ اب اس دفعہ سے سب خرابیاں ختم ہو جائیں گی۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی است

یہ دفعہ احمد رضا قصوری کو ایوان سے نکالے جانے کی وجہ سے حزب اختلاف کے واک آؤٹ کے دوران منظور کر لیا گیا۔ اور لوگوں کے مال اور جائیداد کو چھیننے کا قانونی حق حاصل کر لینے پر سرکاری پارٹی کے ارکان پانچ منٹ تک کھڑے ہو کر بنچ بجاتے رہے۔

دفعہ ۲۵ | اس کا تعلق شہریوں میں مساوات سے ہے کہ تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہیں، محض جنس کی بنا پر کوئی امتیاز نہیں۔ اس کے علاوہ عورتوں کے تحفظ کے لئے مملکت خصوصی انتظامات بھی کر سکتی ہے۔ یہاں بھی شرعی حدود اور امتیازات کا لحاظ ضروری تھا۔ اس لئے مولانا عبدالحق کی ترمیم ۲۷۶ یہ تھی (کہ تمام شہری کی بجائے الفاظ "اسلام کے احکامات کے تابع تمام شہری") شامل کئے جائیں۔ مولانا غلام غوث ہزاروی کی ترمیم ۲۷۷ تھی کہ (ماسوائے اس کے جس کی اسلام نے اجازت دی ہو۔) مولانا ظفر احمد انصاری کی ترمیم ۲۷۸ میں کہا گیا تھا۔ (کہ ماسوائے ان معاملات کے جو قرآن و سنت واضح طور پر مصرح ہیں۔)

دفعہ ۲۶ | یہ ہے کہ تمام مقامات میں داخلے سے متعلق جنس، ذات، مذہب یا وطن کی بنا پر کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ یہ دفعہ جنس یعنی مرد و عورت کو عام مجامع، مجالس اور تفریح گاہوں وغیرہ میں بے محابا اختلاط، مخلوط تعلیم، مخلوط تفریح جیسی تمام باتوں کو آئینی حیثیت دے رہا تھا۔ جبکہ اسلام نے حجاب، پردہ اور عدم اختلاط پر لازمی زور دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ترامیم ضروری تھیں۔ مولانا عبدالحق کی ترمیم ۲۸۱ میں کہا گیا تھا۔ کہ (اس دفعہ میں "یا فحاشی اور بداخلاقی کی روک تھام کیلئے") امتیاز برتنے کی گنجائش رکھی جائے۔ مولانا ظفر احمد انصاری نے یہ مقصد اپنی ترمیم ۲۸۰ میں الفاظ (امن عامہ اور اخلاقیات کے ماسوا) سے حاصل کرنا چاہا۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے اس دفعہ کی شق ۲۔ عورتوں کو خاص انتظامات کئے جانے کی اپنی ترمیم ۲۸۲ میں اس طرح مشروط کرنا چاہا۔ (کہ عورتوں کو عام تفریح گاہوں میں جانے کی اجازت نہ ہوگی۔)

دفعہ ۲۷ | جس کا مقصد یہ ہے کہ ہر قسم کی ملازمتوں اور انتخابی عہدوں میں نسل، مذہب، جنس ذات وغیرہ کی بنا پر امتیاز نہیں کیا جائیگا۔ یہ دفعہ بھی مرد اور عورتوں نیز مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز ختم

کر رہا تھا جبکہ کسی اسلامی سٹیٹ میں غیر مسلموں کو ملک کی بقاء و استحکام و سلامتی نیز مقننہ و قیام عدل جیسے کلیدی مناصب ہرگز نہیں دیئے جا سکتے۔ کہ ایسا کرنا تو ملک کی بھلائی ہے۔ نہ کوئی کافر شرعاً ولایت عامہ پر فائز کیا جا سکتا ہے۔ عورتوں کو بھی ہر قسم کی ذمہ داریوں میں برابر کا شریک ٹھہرانا فطرت سے متصادم ہے۔ مساوات کے نام سے قدرت کی پیدا کردہ استعداد اور قوت کا تفاوت ختم نہیں کر دیا جا سکتا۔ اور نہ مساوات کے نام پر اسلام غیر مسلموں کو نازک ترین ذمہ داریوں میں شریک ٹھہرا کر سٹیٹ کی بنیادوں پر تیشہ چلا سکتا ہے۔ مرزائی ریشہ دوانیاں ہمارے سامنے ہیں۔

الغرض اس وسیع النظری کا خمیازہ پورا عالم اسلام مختلف شکلوں میں بھگت رہا ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کو سر ظفر اللہ کو وزارت خارجہ سے ہٹانے کے لئے بالآخر عظیم جانی قربانی دینی پڑی ---- ایم ایم احمد کی وجہ سے ہم اقتصادی تباہی کا شکار ہیں۔ اور ان کا وجود مشرقی پاکستانی مسلمانوں کے دلوں میں نفرت کا ذریعہ بنا۔ ایسے کلیدی مناصب کا تحفظ نہایت ضروری تھا۔ پھر یہ دفعہ اپنے عمومی لحاظ سے نہ صرف کافروں بلکہ عورتوں تک کو ملک کی صدارت تک پر فائز ہونے کا جواز پیدا کر رہا تھا جس کا ذکر بعد میں عورتوں کی صدارت کا ذکر آنے پر پیرزادہ صاحب نے خود بھی کیا۔ اور اس دفعہ کے پاس کئے جانے کے بعد اس کا حوالہ دیا گیا۔ کہ اب عورتوں کو بھی صدر بننے کا حق مل گیا ہے۔

بہر حال یہاں بھی فریضہ حق ترامیم کی شکل میں ادا کیا گیا۔ مولانا مفتی محمود، مولانا عبدالحق اور دیگر ارکان جمعیۃ کی مشترکہ ترمیم ۲۰۲ میں کہا گیا تھا۔ کہ اس میں الفاظ ---- ماسوائے کلیدی آسامیوں کے ---- شامل کئے جائیں۔ اسی مقصد کو ملحوظ رکھنے والی دوسری ترمیم مولانا عبدالحق کی مستقل ترمیم تھی۔ چونکہ اسی دفعہ کی شق ۲ میں خود یہ استثناء کی گئی تھی۔ کہ کسی مخصوص عہدے اور ملازمت کے مفاد میں ایک جنس کے افراد کے لئے تخصیص کی جا سکتی ہے۔ تو مولانا عبدالحق مدظلہ نے اپنی ترمیم ۲۵۹ میں یہ بھی اضافہ کرانا چاہا کہ ایک جنس کی طرح کسی (خاص مذہب) یا مذہب کے افراد کی جانب سے مناسب طور پر یا (اسلام کی رو سے) بھی تخصیص ہونی چاہئے۔ چوہدری ظہور الٰہی نے اپنی ترمیم ۲۵۳ میں کہا تھا کہ (سیاسی نظریات یا وابستگیوں) کی وجہ سے بھی امتیاز نہیں ہونا چاہئے۔

پالیسی کے رہنما اصول

بنیادی حقوق کا حصہ دفعہ ۲۸ پر ختم ہوا۔ آگے دفعہ ۲۹ سے تکمیلی یعنی پالیسی کے رہنما اصول کا حصہ شروع ہوتا ہے جس کی حیثیت محض ایک خوشنما بورڈ یا جسٹس منیر کے الفاظ میں کسی پارٹی

کے انتخابی منشور اور وعدوں جیسی ہوتی ہے جس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ نہ اسے کسی عدالت میں چیلنج کرایا جاسکتا ہے۔ عوام کے معاشی، سماجی اور فلاحی بہبود نیز اسلامی طریق زندگی، علاقائی تعصبات کی حوصلہ شکنی، سماجی برائیوں، شراب، جوا، قمار، عصمت فروشی کے خاتمہ کی کوششوں کا کچھ ذکر بڑی قیودات اور تاویلات کے ساتھ کیا بھی گیا ہے۔ تو وہ آئین کے اسی غیر آئینی حصہ میں جبکہ عوام کی معاشی سماجی اور فلاحی اصلاح ان کا بنیادی حق اور حکومت کا بنیادی فریضہ ہوتا ہے۔ اس فیاضی کا مظاہرہ اس سے قبل کے دساتیر میں بھی ہے۔ مگر دستور کے اس حصہ میں محض عوام کے فریب نظر کے لئے۔ اسی لئے نہ تو اس پر عمل کرایا جاسکا۔ نہ معاشرتی اور سماجی برائیوں کے خاتمہ کے لئے قدم اٹھ سکے۔ پھر جو حکومت روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لیکر برسر اقتدار آتی ہے۔ اس کا تو فریضہ اولین ہے۔ کہ ان بنیادی ضروریات کو بنیادی حقوق میں اولین مقام دیا جاتا۔ مگر یہاں بنیادی حقوق میں نہ تو روٹی، کپڑا اور مکان کا ذکر ہے، نہ بنیادی طبی امداد، تعلیم مہیا کرنے کی ذمہ داری لی گئی ہے۔ نہ بے روزگاری سے مستقل یا عارضی خلاصی کو شہریوں کا بنیادی حق سمجھا گیا ہے۔ نہ محنت کشوں اور کارکنوں کو ٹریڈ یونینوں کی مراعات، ملازمت کے گھنٹوں کی تعداد، کام کی مقدار، منافع میں کارکنوں کی شرکت وغیرہ کا ذکر ہے۔ نہ کسی اور طرح مزدوروں اور غریب عوام کی اقتصادی اور معاشرتی فلاح یا ملک کی سماجی اور معاشرتی خرابیوں کے ازالہ کا ذکر ہے۔

بنیادی حقوق سے متعلق ۲۲ دفعات میں ایسا مخفی سے مخفی چور دروازہ بھی بڑی احتیاط سے بند رکھا گیا ہے۔ جس سے کہ عوام اسٹیٹ کے خلاف کسی عدالت عالیہ میں اپنے ان بنیادی حقوق اور ضروریات کی فریاد رسی کر سکیں۔ بخلاف اس کے اسلام عوام کی معاشی اور سماجی حالت سدھارنے اور شہریوں کو زندگی کی بنیادی ضروریات مہیا کرنے کا اس حد تک ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ فرمایا کہ اگر ملک کے دوسرے حصے میں فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک کی وجہ سے مرگیا۔ تو مجھ سے باز پرس ہوگی۔ لو ماتت الکلب علی شط الفرات جوعاً لکان عمر مسئولاً عنہ۔ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایسے الفاظ کسی خارش زدہ اونٹ کو دوائی نہ ملنے کے بارے میں کہے، لیکن یہاں جب بنیادی حقوق میں اس کمی کی طرف توجہ دلائی گئی تو بڑی جرأت اور ڈھٹائی سے پالیسی کے رہنما اصول کا حوالہ دیکر ایسی تمام ترامیم کو مسترد کردیا گیا۔ جسے قبول کرنا کسی اور کا نہیں۔ تو مساوات محمدی، عوام اور سوشلزم جیسے خوشنما الفاظ کو اوڑھنا بچھونا بنانے والوں کا لازمی فریضہ تھا۔ اس کے باوجود کہا جارہا ہے کہ حزب اختلاف سرمایہ داری کے تحفظ

عوام کے استحصال اور ان کی سماجی اور معاشی بہبود کی مخالفت میں یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ مگر اب تو صدر کو پیش کردہ مجوزہ متفقہ بارہ نکاتی ترامیم میں ایسی ترامیم بھی سامنے آگئی ہیں۔ جو ترامیم پیش کرنے والوں کے استحصال کے تحفظ کی نہیں بلکہ آئین کے ذریعہ ان چیزوں کے استیصال کی ضمانت دینے کی خواہشات کی کھلی شہادت دے رہے ہیں۔ متحدہ محاذ نے بنیادی حقوق سے متعلق متفقہ ترمیم ۲ کی شق ۵ میں کہا ہے کہ حکومت کو ارتکاز دولت ختم کرانے ہر فرد کو خوراک، لباس، مکان، طبی امداد فراہم کرنے کی ذمہ داری بنیادی حقوق ہی میں لینا چاہیئے۔ اس طرح کارکنوں کو اجتماعی سودے بازی، ہڑتال، انتقامی نظر بندی اور مقدمہ چلائے بغیر کسی کو قید نہ کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا ہے (جنگ ۲۵ مارچ متفقہ ترامیم)

مگر اس سے کیا ہوتا ہے، جو لوگ عوام کے ان بنیادی حقوق کے لئے اسمبلی کے اندر اور باہر بے جگری سے لڑ رہے ہیں۔ ان پر رجعت پسند اور استحصال گروہ، سرمایہ داروں کے ایجنٹ اور اس قسم کی ایک پھبتی کس دینے پر یہ سارے مسئلے خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ اور عوام کو جنت المعاد کی تمام نعمتیں خود بخود میسر آجاتی ہیں۔

بہر تقدیر بنیادی حقوق کا حصہ ختم ہونے پر آئین میں اس خلاء کو پُر کرانے کی متعدد ترمیمیں سامنے آئیں۔ شوکت حیات صاحب، نورانی صاحب، پروفیسر غفور احمد صاحب، مزاری صاحب کی مشترک ترمیم ۲۹۲ مولانا مفتی محمود مولانا عبدالحق مدظلہ مولانا عبدالحکیم، مولانا صدر الشہید مولانا نعمت اللہ اور مولوی عبدالحق لورالائی کی مشترک ترمیم ۲۹۶ چوہدری ظہور الٰہی کی ترمیم ۲۹۸ محمود علی قصوری کی ترمیم ۲۹۹ عبدالحئی بلوچ کی ترمیم ۳۰۰ کا تعلق مختلف شکلوں میں انہیں باتوں سے تھا۔ کہ قوم کی معاشی، سماجی، دینی، اخلاقی اور معاشرتی فلاح و بہبود سے متعلق دفعات بنیادی حقوق کے حصہ میں بڑھا دیئے جائیں۔ اور تو اور ایوان میں پی پی پی کے سرگرم وکیل ملک محمد اختر نے بھی یہ کمی محسوس کی تھی۔ اور ان کی ترمیم ۲۹۷ میں بھی اس قسم کی بہت سی چیزوں کی دفعہ رکھنے کی تحریک کی گئی تھی۔ مگر ان سے اپنی ترمیم واپس کرالی گئی۔ اور دیگر تمام ترامیم مسترد کر دی گئیں۔

دفعہ ۲۹، ۳۰ | یہاں سے پالیسی کے رہنما اصولوں کا آغاز کیا گیا۔ اور بہت حسین وعدوں کا ذکر ہے۔ مگر اس کے بارہ میں دفعہ ۲۹ اور ۳۰ میں یہ وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے۔ کہ ان اصولوں کی پابندی کا انحصار وسائل کے میسر ہونے پر ہوگا۔ نیز ان اصولوں کے سلسلہ میں کسی اقدام کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔ اور نہ یہ کوئی قانون یا عمل اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور نہ اس بارہ

میں مملکت یا کسی حیثیت مجاز کے خلاف کوئی قانونی کاروائی کی جاسکے گی۔ ان تمام گنجائشوں کے بعد انصاف کے فروغ، سماجی برائیوں کے ازالہ، اسلامی طریق زندگی اور معاشی، سماجی بہبود کے فروغ وغیرہ کا آغاز بھی کسی ذمہ دارانہ الفاظ کی بجائے اس طرح کیا گیا تھا، کہ مملکت کوشش کرے گی ۔۔۔ الخ (ملاحظہ ہو دفعات ۳۱، ۳۵ وغیرہ)۔ ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے بھی آئین کے اس حصہ میں خاصی ترامیم آئیں اور زوردار تقریریں ہوئیں۔

راؤ خورشید علی نے کہا کہ ان اصولوں کو اپنانے کے لئے انتظامیہ کو واضح ہدایات ملنی چاہئیں۔ میاں محمود علی قصوری نے پالیسی کے اصولوں کو ردی کا غذ قرار دیا۔ جن پر عمل درآمد کرنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا۔ شوکت حیات نے کہا کہ اب ممکن نہ ہو تو ایک محدود عرصہ کے بعد حکومت کو ان باتوں کا پابند بنالیا جائے۔ محمود اعظم فاروقی نے کہا کہ ان خوشنما وعدوں کے شرمندۂ تعبیر ہوسکنے کیلئے ایک خاص دفعہ رکھی گئی ہے۔

صاحبزادہ صفی اللہ نے کہا کہ نفاذ دستور کے ۵ سال بعد ان وعدوں کو پورا کیا جائے۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہا جب حکومت آرڈیننسوں کے ذریعہ احکام نافذ کرسکتی ہے تو سماجی برائیوں کا بھی فوری ازالہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر سرکاری پارٹی کے سرکاری وکیل ملک اختر صاحب نے جوابی تقریر میں کہا کہ ابھی ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں۔ جناب پیرزادہ صاحب نے کہا کہ یہ تو رہنما اصول ہیں۔ انتظامیہ اس کی روشنی میں کام کرے گی۔ مگر اصولوں پر عملدرآمد کا انحصار وسائل پر ہے۔ اب ہم یہاں اس باب سے متعلق اہم ترمیمات پیش کریں گے۔ سردار مولا بخش سومرو نے ترمیم ۲۹۸ میں کہا کہ مملکت کا فرض ہوگا کہ یوم آغاز کے پانچ سال کے اندر اندر ان اصولوں کے نفاذ کو یقینی بنائے۔ الخ ظفر احمد انصاری صاحب کی ترمیم ۳۰۶ میں ان اصولوں کو روبہ عمل لانے کی خاطر وسائل حاصل کرنے کو تقدیم دینے پر زور دیا گیا تھا۔ اور یہ کہ ان وسائل کے لئے تعیش پسندانہ چیزوں میں کمی کرائی جائے۔ دفعہ ۳۰ میں سردار شوکت حیات اور نورانی صاحب وغیرہ کی مشترکہ ترمیم ۳۱۵ یہ تھی۔ کہ یوم آغاز سے دس سال ختم ہوجانے کے بعد قانونی چارہ جوئی کا حق ہوگا۔

دفعہ ۳۱ | اسلامی طریق زندگی کے سلسلہ میں اسلامی تعلیم کو لازمی قرار دینے، اخلاقی معیاروں کی تعمیل کی فروغ اور زکوٰۃ اوقاف، مساجد کی مناسب تنظیم اور قرآن و سنت کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھنے کی سہولتیں فراہم کرنے کے وعدے کئے گئے تھے۔ مولانا انصاری نے ترمیم ۳۱۶ کے ذریعہ

ان اداروں میں عربی زبان سیکھنے کی حوصلہ افزائی کرنے کا اضافہ کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ اسوقت موجود نہ تھے۔ اور ترمیم پیش نہ کر سکے۔ وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی نے اپنی طرف سے یہ ترمیم پیش کی، کہ عربی کے فروغ وتعلیم کی کوشش کرنے کا اضافہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ عربی زبان کی اہمیت اور قرآن کریم کی صحیح طباعت کے مسئلے زیر بحث آئے۔ مفتی محمود صاحب، چوہدری ظہور الٰہی، مولانا عبدالحکیم صاحب اور دیگر حضرات نے نیازی صاحب کی ترمیم کے حق میں زوردار تائیدی تقریریں کیں۔ اور عملاً یہ ثابت کرادیا کہ ادھر سے کسی بھی اچھی بات کی تائید اور تحسین سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔ یہ ترمیم معقول تھی اور منظور ہوئی۔ مگر معلوم نہیں اس جانب سے سوائے انصاری صاحب کی اس ترمیم کی تمام دیگر معقول ترامیم کو کیوں غیر معقول سمجھا جاتا رہا۔ چوہدری ظہور الٰہی نے کہا کہ یہ فراخدلی ہوئی بھی تو پالیسی کے رہنما اصولوں میں۔ کاش بنیادی حقوق جیسی دفعات میں یہ مظاہرہ ہو جاتا۔

مولانا عبدالحق مدظلہ نے اس دفعہ میں زکوٰۃ مساجد اور اوقاف کی تنظیم سے متعلق دفعہ کو اپنی ترمیم ۳۱۷ سے (اسلامی احکام کے مطابق) پابند کرانا چاہا۔ اور اس پر تقریر کی جو دوسری جگہ شریکِ اشاعت ہے۔ پی پی پی کے میاں منظور حسن کے ترمیم ۳۱۸ میں اسلامی قانونِ وراثت کو سختی کے ساتھ ملحوظ رکھنے کا ذکر تھا۔ مگر جیسا کہ اب تک ہوتا رہا۔ ایسی اچھی ترامیم داخل کرنے کا سجدہ سہو پی پی پی کے ارکان کو اس کے واپس لے لینے کی شکل میں کرنا پڑتا رہا۔ اس کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔

خواتین کے بارہ میں اس دفعہ کے بعد الحاد طرزِ فکر کی پرجوش ترجمان خاتون رکن نسیم جہاں نئی دفعات رکھوانا چاہتی تھیں۔ کہ نہ صرف بلدیاتی اداروں میں بلکہ عورتوں کا مرتبہ بلند کرنے کی غرض سے عورتوں کی خصوصی رضاکارانہ تنظیم کی تشکیل ضروری ہے۔ اس کی مخالفت میں خود خواتین ارکان نے تقریریں کیں اور اسلامی نقطہ نظر کی زوردار ترجمانی کی۔ بیگم شیریں وہاب ایسے مواقع پر ویسے بھی اسلامی طرزِ فکر اور اعتدال روی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ پی پی پی کی خاتون ارکان کی مخالفت اگرچہ حزب اقتدار کی ہدایات پر تھی، تاکہ نسیم جہاں سے ترامیم واپس کرائی جائیں۔ مگر پھر بھی اس شر سے اسلام کی ترجمانی کی خیر کا پہلو نکل ہی آیا۔ ویسے بھی جیسا کہ وزیر قانون وغیرہ نے کہا، کہ جب آئین میں پہلے سے عورتوں کے ساتھ بڑی فیاضی رکھی گئی ہے، تو اب مزید جھگڑوں کی کیا ضرورت ہے۔ شیریں وہاب نے کہا کہ اسلام اور مذہب کے ذریعہ ہمیں اتنی مراعات مل سکتی ہیں، جو مغربیت سے نہیں۔ مسیحیت نے تو خواتین کو کچھ دیا ہی نہیں۔ ہمارے لئے اپنا ضابطہ سیاست کافی ہے۔ ایسے مسائل میں دوسری اقوام اور ملکوں کو مثال میں پیش نہیں کرنا چاہئے۔ حضور اقدسؐ نے عورتوں کو جو بلند مقام دیا، کسی نے

اتنا نہیں دیا۔ پاکستان کو اشتراکی ممالک کی پیروی کی ضرورت نہیں، نہ ہمیں کیمونسٹوں کی نقل کرنی چاہئے۔ مسز نرگس نعیم پی پی پی نے نسیم جہاں کی مخالفت میں کہا کہ ہم پاکستانی عورتوں کو غیر ملکی عورتوں کی ایسی باتوں کی نقل نہیں کرنی چاہئے بلکہ اس کی بجائے انہیں اسلام اور اپنی روایات کو اپنانا چاہئے۔ دوسرے دن مولانا عبدالحق مدظلہ نے اپنی تقریر میں نسیم جہاں کی خواتین کے لئے مجوزہ رضاکارانہ تنظیموں کے بارہ میں کہا کہ اگر خدانخواستہ عورتوں کی ایسی رضاکار تنظیمیں آج بھارت کے قبضہ اور قید میں ہوتیں تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔ اور خواتین افواج کے ہاتھوں ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ ہوتے۔ احمد رضا قصوری ایک طرف مذہبی معاملات میں بڑے پرجوش ہیں۔ دوسری طرف یہاں انہوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں عورتوں کی مکمل شمولیت کی ترمیم پیش کی۔ یہ تضاد یا تو ان کی جذباتی طبیعت کا کرشمہ تھا۔ یا پھر ذہنی ناپختگی تاہم دینی معاملات اور اسلامی ترامیم میں ان کا کردار آخر تک قابل تحسین رہا۔

اس کے بعد دفعات ۳۲، ۳۳، ۳۴ مسودہ سے نامعلوم وجوہات پر حذف کر دی گئی ہیں۔

جھنگ کے مولانا محمد ذاکر صاحب جو بوجہ ضعف بہت کم ہی ایوان کی کارروائی میں حصہ لیتے ہیں۔ نے دفعہ ۳۱ میں اپنی ترمیم کی مناسبت سے اپنے پرسوز اور دردمندانہ جذبات کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ اگر آئین میں اسلام کے تحفظ کے لئے واضح شق رکھ دی جاتیں، تو ترمیموں کی نوبت ہی نہ آتی اب اگر ترمیم واضح ہو، نیت درست ہو تو کسی ترمیم پر رائے شماری کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ ایک نازک صورت حال ہے۔ ہم ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ اگر اب بھی نتائج سے سبق نہ لیا گیا، تو ہمیں اس کا دردناک خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ شیخ رشید کی اضافی ترمیم کر سوشلزم معیشت کا مدار ہوگا۔ اتنا بڑا ظلم ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ قرآن مکمل ضابطہ حیات ہے۔ تو ازم کی کیا ضرورت۔ انہوں نے کہا۔ میں چند دن اور جائزہ لے رہا ہوں، اصلاح نہیں ہو سکتی۔ تو آخری اقدام کر کے استعفیٰ پیش کر دوں گا۔ کیونکہ اس صورتحال میں میں اس اسمبلی میں بیٹھنا گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔

دفعہ ۳۵ شہریوں میں علاقائی، نسلی، قبائلی، صوبائی عصبیتوں کی حوصلہ شکنی کے بارہ میں ہے۔

محمود علی قصوری چاہتے تھے کہ اس اہم دفعہ کو بنیادی حقوق میں منتقل کیا جائے۔ انصاری صاحب کی ترمیم تھی کہ ان عصبیتوں میں بدترین عصبیت لسانی بھی ہے۔ اسے بھی دفعہ میں جگہ دی جائے۔ انہوں نے سندھ وغیرہ کے لسانی فسادات کا ذکر کیا۔

دفعہ ۳۶ اس کا مقصد قومی زندگی کے تمام شعبوں میں عورتوں کی مکمل شمولیت کو یقینی بنانا

کے اقدامات کے بارہ میں ہے۔ انصاری صاحب کی ترمیم تھی کہ (اگر ایسا کرنا اسلامی اقدار اور اسلامی احکامات کے خلاف نہ ہو) بعد میں ۳۹ کی شق (ٹے) (جس میں عورتوں کو ان کی عمر یا جنس کے لحاظ سے نامناسب پیشوں پر مجبور نہ کرنے کا ذکر ہے۔) پر تقریر (جو شریک اشاعت ہے۔) کرتے ہوئے مولانا عبدالحق مدظلہ نے اس کھلے تضاد کی طرف اشارہ کیا۔ اور فرمایا کہ دراصل ہر شعبہ میں مکمل نمائندگی کی بات فطرت کا مقابلہ ہے۔ اور ۳۹ کی مذکورہ شق میں ہم خود تسلیم کر رہے ہیں۔ کہ عورتیں زندگی کے ہر شعبہ میں شمولیت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اس لئے دفعہ ۳۶ کی اس کلی مساوات کو مشروط اور محدود کرنا ضروری ہے۔ مگر اتنی واضح بات پر بھی کان دھرنے کی توفیق اکثریت کو کب نصیب ہو سکتی تھی۔

دفعہ ۳۹ اس میں پسماندہ علاقوں کے پسماندہ طبقات ملک کے تعلیمی، معاشی مفادات کے فروغ، شراب جوا، زنا فحش ادب اور دیگر سماجی برائیوں کے خاتمہ کا ذکر اس آغاز سے کیا گیا ہے۔ کہ مملکت "ایسا کرنے کی کوشش کرے گی"۔ یہاں مولانا عبدالحق کی ترمیم ۳۳۱ یہ تھی کہ ان ابتدائی سطور کو اس طرح تبدیل کیا جائے۔ کہ (مقتضیات اسلام کے مطابق مملکت کے لئے لازم ہوگا۔) اور تحریک پر اپنی تقریر میں واضح کیا۔ کہ کوشش اور ذمہ داری لینے میں کیا فرق ہے۔ انہوں نے کہا کہ کوشش تو انگریز کے دور میں بھی ہوتی رہی، ۲۶ سال سے بھی ہو رہی ہے۔ علماء منبر و محراب سے ان باتوں کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور الحمد للہ کہ عقائد کی حد تک یہ کوششیں کامیاب رہی ہیں۔ اور معاشرہ ان باتوں کو برا سمجھتا ہے۔ مگر اقتدار ملنے کے بعد حکومت کوشش نہیں کرتی، بلکہ عملاً اسکی ذمہ داری ہوتی ہے، کہ اقتدار، قوت، فوج، پولیس، قانون کے ذریعہ ان خرابیوں کا فوری انسداد کرے۔۔۔۔

سردار مولا بخش سومرو، ظفر احمد انصاری، نسیم جہاں، عبدالعزیز بھٹی نے بھی "کوشش کرے گی" کو حذف کرنے کی ترمیمیں پیش کیں۔ عبدالحی بلوچ، احمد رضا قصوری، جناب بزنجو اس دفعہ کو باب اول میں منتقل کرانا چاہتے تھے۔ شاہ احمد نورانی معہ تین رفقاء (شوکت حیات، پروفیسر غفور احمد، مزاری صاحب) کی ترمیمیں مشترکہ ہوتی تھیں، نے مفت ثانوی تعلیم کو کم ازکم پانچ سال میں مہیا کرنے پر زور دیا اس دفعہ کی شق (ج) اور (چ) میں عصمت فروشی، قماربازی اور دیگر سماجی خرابیوں کی روک تھام کا ذکر تھا۔ مولانا عبدالحق صاحب نے اپنی ترمیم ۳۳۵ کے ذریعہ اس میں یہ ترمیم کرانی چاہی کہ (ج۔ یوم آغاز کے فوراً بعد عصمت فروشی، قماربازی، مضر ادویات کا استعمال، فحش ادب اور

اشتہارات کی طباعت، نشرواشاعت اور نمائش کی مکمل روک تھام کرے) شاہ احمد نورانی کی شرکہ ترمیم اور خورشید علی وغیرہ کے بھی منشیات کے بارہ میں اسی طرح ترمیمیں تھیں۔ پی پی پی کے میاں منظور حسین صاحب اس میں فحش فلمیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگرام بھی شامل کرانا چاہتے تھے۔ مگر کاش کہ حزب اختلاف کے نہیں تو پی پی پی والوں کی ایسی اچھی ترامیم کو تو شرف پذیرائی بخش دیا جاتا۔ مگر ان کے لئے استرداد کا اصول کارفرما رہا تو ان کے لئے استرجاع کا کہ ان سے سجدہ سہو کرانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ شراب وغیرہ کی ترمیمات پر نوابزادہ نصراللہ نے۔ تدریجی اقدامات اور کوششوں کے وعدوں سے ۲۶ سال کا عرصہ گزر گیا۔ زرمبادلہ اور معیشت کی بربادی کے علاوہ شراب نے نصف ملک کو گنوا دیا مسلمانوں کا کردار بگڑتا چلا جا رہا ہے۔ اس لئے متعینہ مدت میں شراب وغیرہ کی مکمل بندش ضروری ہے۔

راؤ خورشید علی نے کہا کہ ہم نے دستوری طور پر طے کیا ہے۔ کہ تمام اصلاحی اقدامات کتاب و سنت کی روشنی میں ہوں گے۔ اسلام میں طبی نقطۂ نظر کے لئے بھی شراب کی اجازت کی گنجائش نہیں، شریعت نے جس چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ اس میں شفاء رکھی ہی نہیں۔ اگر کوئی شراب پیئے بغیر مر رہا ہے، تو اُسے مر جانا چاہئے۔ اس ارض پاک کو اس کے وجود نامسعود سے پاک رکھنا ہی بہتر ہے جو لوگ طبی ضرورت اور غیر مسلم کے نام سے استثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں وہ پینا خود چاہتے ہیں۔ مگر بندوق غیر مسلموں کے کندھوں پر رکھتے ہیں۔ یہاں سیاسی مقاصد کے لئے تو اتنی مار دھاڑ ہو رہی ہے۔ اور جہاں اصلاح معاشرہ کی بات ہو۔ اس میں چور دروازے اور رعائتیں پیدا کی جاتی ہیں۔

وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن نے ان تقاریر کے جواب میں وہی استیصال والا الہ دین کا چراغ استعمال کیا، اور کہا کہ ان چیزوں کی برائیوں کے بارہ میں مجھے اپنے دوستوں سے اختلاف نہیں مگر یہ منزل حاصل کرنے کے لئے ذرا گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ ان تمام برائیوں کی وجہ ہمارے ہاں کا معاشی نظام ہے۔ سودی نظام اکنامک پاور حاصل کرنے کے جذبہ کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اور ہم نے تحدید ملکیت اور جائیداد کی ضبطی کی دفعات اسی لئے رکھی ہیں — ہم سوشلسٹ معیشت قائم کریں گے تو برائیوں کی جڑ کٹ جائے گی۔ مولانا عبدالحق کی اس بات (کہ منبر و محراب پر علماء کا برائیوں کے خلاف مساعی کا بھی حصہ رہا ہے۔) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مبشر حسن صاحب نے کہا کہ محض منبر و محراب اور تبلیغ سے کہیں ہوتا۔ کچھ اثر ہوا ہوگا۔ مگر جڑ نہیں کٹی اور وہ سوشلسٹ معیشت سے کٹ جائے گی۔ اس بحث و مباحثہ کے بعد لفظ کوشش کے حذف کرنے سے متعلق ترمیمیں تو منظور کرلی گئیں۔ مگر دیگر تمام اضافی اور تشریحی ترمیمیں

ساقط ہوئیں۔ اور سمندر سے پیاسے کو شبنم کا یہ قطرہ ملا بھی تو اس وجہ سے کہ اس باب کی دفعات کے احتساب اور ذمہ داری کی کوئی قانونی صورت ویسے بھی نہیں تھی۔ مگر تمام معروفات قائم کرنے اور منکرات مٹانے جیسی بے ضرر دفعہ بھی وعدہ کی شکل میں سہی مگر شامل نہ کی سکی۔

دفعہ ۳۹ میں مولانا عبدالحق صاحب اپنی ترمیم ۳۵۵ کے ذریعہ حسب ذیل نئے پیرے شامل کرنا چاہتے تھے۔

(ج۔ ملک میں مروجہ نظام و نصاب تعلیم کے ہر شعبہ کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرے۔

د۔ قومی اور علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ عربی زبان کو مسلمانوں کی مشترک دینی زبان کی حیثیت سے فروغ دے۔ ڈ۔ تمام معروفات کو فروغ دے اور تمام منکرات کو مٹائے)

اپنی ترمیم کی تشریح میں مولانا عبدالحق نے کہا کہ ۲۶ سال گزرنے کے بعد بھی انگریزی نصاب و نظام تعلیم کی بدولت انگریزی تہذیب و تمدن اور مغربی طور طریقے ہم پر مسلط ہیں۔ اس تعلیم کی وجہ سے ذہنیت بدستور غلامانہ ہے۔ اس لئے ہر شعبہ کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنا چاہئے۔ زبان کا بھی یہی معاملہ ہے ہزاروں میل دور سے غاصبانہ تسلط جمانے والی قوم کی انگریزی ہم پر مسلط ہے۔ تو عربی جو خدا کی وحی رسول کی زبان اور تمام اسلامی ذخیرہ اور ورثہ کی زبان ہے، کیوں اہمیت کی مستحق نہیں اسی طرح معروفات کو فروغ اور منکرات کا مٹانا اسلامی اسٹیٹ کا حسب ارشاد خداوندی اولین فریضہ ہے۔

مولانا ظفر احمد انصاری کی ترمیم ۳۵۶ یہ تھی کہ پرسنل لاء یعنی عائلی قوانین کے تنازعات کو اسلامی قوانین کے مطابق طے کرنے کے لئے گشتی عدالتیں اور مقدمہ بازی کی حوصلہ شکنی کے لئے مقامی مصالحتی کونسلیں قائم کی جائیں۔

دفعہ ۴۰ اس میں عوام کی معاشی سماجی فلاح و بہبود سے متعلق اقدامات کا ذکر ہے کہ مملکت ایسے امور کی کوشش کرے گی۔ یہاں بھی ترامیم کے ذریعہ کہا گیا تھا کہ کوشش کی بجائے مملکت کے لئے لازم ہونا چاہئے۔ محمود علی قصوری، ڈاکٹر عبدالحی بلوچ، بزنجو وغیرہ کی ترمیم میں کہا گیا تھا کہ ایسے بنیادی مسائل اور ضروریات سے متعلق دفعہ کو بنیادی حقوق میں شامل کرنا چاہئے۔ روزگار، تعلیم، علاج و وسائل معاش مہیا کرنے جیسی بنیادی باتوں کا صرف وعدہ کافی نہیں۔ بزنجو نے اس میں ٹریڈ یونین کی تشکیل، روزگار کی فراہمی، ہر شہری کو مسلح افواج میں شامل ہونے کے حقوق بڑھانے کا ذکر کیا۔ انہوں نے ترمیم پر کہا کہ اگر ۹۷ فیصد غریب آبادی کو حقوق نہیں دئیے جاتے تو وہ آئین قابل قبول

نہیں ہو سکے گا، یہ ملک اس لئے نہیں بنا تھا کہ پیپلز پارٹی کے ایجنٹ، چند سرمایہ دار وڈیرے غریب عوام کا استحصال کریں۔ شیخ رشید نے ان کے جواب میں کہا کہ یہ لوگ ایک طرف استحصال ختم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف حصول جائداد کی دفعہ کے خلاف ہیں۔ یہ قول اور فعل کا تضاد ہے۔

اس دفعہ کی شق ۲ میں ربا کو جتنی جلد ممکن ہو ختم کرنے کا ذکر ہے۔ ربوا جیسی لعنت کا ذکر (وعدہ) کے باب میں اور پھر صرف "جتنی جلد" کے الفاظ میں) بعض پچھلے دساتیر میں بھی چلا آرہا ہے۔ اس جتنی جلد کا تعین ضروری ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب نے ترمیم ۳۶۷ میں تحریک فرمائی کہ (ربوا کو زیادہ سے زیادہ تین سال میں ختم کرے اور اس کے لئے ماہرین شریعت و اقتصادیات کی ایک کمیٹی ترتیب دے جو موجودہ بنک سسٹم کو غیر سودی بنیادوں پر اسلامی اصول کے مطابق تبدیل کر دے۔)

انصاری صاحب کی ترمیم ۳۶۸ میں بھی تین سال اور شوکت حیات صاحب، نورانی صاحب، مزاری صاحب، پروفیسر غفور صاحب کی ترمیم ۳۶۶ میں پانچ سال کا تعین کیا گیا تھا۔ اور یہ اس لئے کہ برسوں سے مستقل سودی نظام کو فوری طور پر تبدیل نہیں کیا جا سکتا تو یوم نفاذ کے بعد اگر ایک موزوں کمیٹی اسے اسلامی اقتصادیات کے سانچے میں ڈھالنے کا کام شروع کر دے تو تین سال میں اسے مکمل تبدیل کرنا مشکل کام نہیں۔ مولانا نے اپنی تقریر میں کہا کہ اکتناز دولت اور استحصال ختم کرنے کی دعویدار عوامی حکومت کا تو یہ سال بنیادی فریضہ ہے کہ سود کو یکسر ختم کرا دے۔ پھر سودی نظام کے بارہ میں جیسے خدا کی طرف سے اعلان جنگ ہے تو بحیثیت مسلمان جلد از جلد اس سے چھٹکارا لازم ہے۔ ورنہ خطرہ ہے کہ ملک ہی اس لعنت کی وجہ سے ختم ہو جائے۔

صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مفتی محمود نے کہا کہ ہم دیگر ممالک سے تو چاہتے ہیں کہ بغیر سود قرضہ دیا جائے مگر اپنے ملک میں سود کی لعنت کیوں ختم نہیں کرتے۔ پی پی پی کے میاں شفقت حسین نے اپنی ترمیم ۳۶۹ میں بنکاری کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لینے اور سود کی وصول فوراً بند کر دینے کا کہا تھا۔ مگر سود سے متعلق یہ تمام ترامیم بیک جنبش مسترد ہو گئیں۔ احمد رضا قصوری نے اس دفعہ کے بعد کارکنوں کو اجتماعی سودا بازی، گیارہ ایجریٹ، کام کی، کارکنوں کی آرام و آسائش کی ضمانت سے متعلق نئی دفعہ بڑھانا چاہی۔ ملک جہانگیر خان نے قبائلی اور دیہاتی علاقوں میں عدم مساوات دور کرنے سے متعلق نئی دفعہ رکھنا چاہی۔ مگر یہ ترمیمیں بھی مسترد ہو گئیں۔

دفعہ ۴۰ | یہ دفعہ مسلم ممالک سے ساتھ دوستی کے رشتے مضبوط کرنے اور بین الاقوامی امن کو فروغ دینے سے متعلق ہے۔ انصاری صاحب نے اپنی ترمیم میں اس دفعہ میں کشمیر، فلسطین اور

مشرقی پاکستان کی آزادی، افریقہ اور ایشیا کے مشترکہ مفادات، کی حمایت اور ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ نے بین الاقوامی سامراجیت کے خلاف جدوجہد آزادی کی حمایت پر زور دیا مگر یہ دفعہ بھی بغیر کسی ترمیم کے منظور ہوگئی۔ اس دفعہ پر پالیسی کے رہنما اصول والا باب ختم ہوتا ہے۔ اور سوائے دو ایک لفظی ترمیمات کے اسلامی، معاشی، سماجی امور سے متعلق تمام اہم ترامیم نظرانداز ہوگئیں۔

حصہ سوم - باب اول

صدر

اس حصے کا تعلق صدر پاکستان کی اہلیت، مذہب، عہدے کا انتخاب، حلف، عہدے کی شرائط اور میعاد، سزاؤں کی تخفیف، اس کے اختیارات، صدر کی برطرفی، وزیر اعظم کے مشورے پر عمل کرنے کی پابندی اور چیئرمین یا سپیکر کے صدر کی قائم مقامی وغیرہ امور سے ہے۔

دفعہ ۴۲: اس دفعہ کے ذیل میں کہا گیا ہے۔ کہ کوئی شخص بجز اس کے صدر کے انتخاب کا اہل نہ ہوگا جب تک وہ ۴۵ سال کی عمر کا مسلمان نہ ہو اور قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کا اہل نہ ہو۔

یہاں علماء کی طرف سے دو قسم کی ترمیمیں آئیں۔ ایک یہ کہ صدر کی کم از کم عمر ۴۵ سال کی بجائے چالیس سال کافی ہے۔ دوسری یہ کہ صدر کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ تیسری بات کا تعلق صدر کی دینی اور اخلاقی اہلیت سے تھا۔

مولانا عبدالحق کی ترمیم ۲۲۹ اور جمعیۃ العلماء اسلام کی مشترکہ ترمیم ۲۳۰ ، مولانا غلام غوث ہزاروی کی ترمیم ۲۳۱ میں کہا گیا تھا۔ کہ صدر کیلئے کم از کم چالیس سال کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے۔ چوہدری ظہور الٰہی اور امیر زادہ خان کی ترمیم میں بھی چالیس سال کا کہا گیا تھا۔

محرکین نے اپنی تقریروں میں زور دیا، کہ اسلامی اصولوں کے مطابق عورت سربراہ مملکت نہیں ہو سکتی۔ مولانا عبدالحق نے اپنی تقریر میں کہا کہ چالیس سال کی عمر میں انبیاء کرام کو نبوت مل سکتی ہے۔ تو خلیفہ اسلامی کے لئے بھی جو نائب رسول ہوتا ہے۔ یہی عمر کافی ہے۔ اور اس کا مرد ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے ذمہ آئین کی نگرانی، دوسری اقوام سے معاہدات، صلح، اسلامی امور کی نگرانی کا فروں سے مقابلہ افواج کی تنظیم جیسی گرانبار ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اس لئے صدر شجاعت، اور مردانگی کا مظہر ہونا چاہیئے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ایسی قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس کی امیر عورت ہو۔ مرد ہی صلح اور جنگ کا سربراہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا، اگر ایک خاتون رکن کی تجویز کے مطابق فرشتہ میں عورتیں ہوتیں۔ اور وہ بھاری

قید میں چلی جاتیں، تو کیا ہوتا۔ بہرحال صنفِ نازک کو صدارت کی ذمہ داری نہیں سونپی جا سکتی۔

مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہا کہ ہم یہ قید لگا کر عورتوں کی مخالفت نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ صرف اسلام کے اصول بیان کر رہے ہیں۔ اگر عورتوں کو سربراہِ مملکت بننے کی اجازت دی گئی، تو ملک تباہ ہو جائے گا۔

خواتین ارکان بیگم نسیم جہاں، مسز اشرف عباسی اور مسز نرگس نعیم نے مولانا عبدالحق اور مولانا غلام غوث ہزاروی کی تقریروں پر احتجاج کیا۔ مسز نعیم نے کہا کہ اگر مولانا ہزاروی نے اپنے الفاظ واپس نہ لئے تو ہم ایوان سے واک آؤٹ کر جائیں گے۔ نسیم جہاں نے کہا مسلم ممالک میں بڑے اونچے پائے کے علماء موجود ہیں۔ مگر کہیں بھی عورت کے سربراہِ مملکت بننے کی مخالفت نہیں ہوتی۔ پاکستان کے علماء کیوں مخالفت کرتے ہیں۔ مولانا غلام غوث صاحب نے جواب دیا کہ دیگر ممالک کے علماء نے اسلامی کانفرنس کے موقع پر پاکستانی علماء کے اسی جذبۂ اظہارِ حق کی تعریف کی ہے۔ یہاں کے علماء جس طرح فریضۂ حق ادا کر رہے ہیں۔ وہ دیگر ممالک کے لئے نمونہ ہونا چاہئے۔ مسز اشرف نے کہا کہ یہ ترمیم بے کار ہے اس سے کہ پہلے ہی ایک شق منظور ہو چکی ہے۔ (علماء کی مخالفانہ ترامیم کے باوجود) کہ صنف کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ وزیرِ قانون نے بھی اپنا وزن عورتوں کے پلڑے میں ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ سارا بحث و مباحثہ بے سود ہے۔ اس لئے کہ مردوں اور عورتوں کی مساوات سے متعلق دفعات منظور ہو چکی ہیں۔ صدرِ دستور ساز نے بھی ان کی تائید کرتے ہوئے بحث ختم کرائی۔ اور ترمیمیں مسترد ہو گئیں۔

مرد اور عورت کے اس جھگڑے میں یہ بحث چھڑی کہ پاکستان کی تباہی کا ذمہ دار کونسی صنف ہے۔ ایک آواز آئی کہ اس کا ذمہ دار ایک شرابی اور زانی مرد تھا۔ ہزاروی صاحب نے کہا کہ اس شخص کو عورتوں نے خراب کیا۔ ایک اور آواز آئی کہ ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے کہ سابق صدر یحییٰ کو خراب کرنے والی جنرل رانی عورت تھی یا کوئی مرد تھا۔؟

عورت اور مرد کی صدارت کے لئے اہلیت کی اس بحث نے کچھ دیر کے لئے اس دور کی یاد تازہ کر دی کہ سابق صدر ایوب اور فاطمہ جناح کے انتخابی معرکہ کے دوران ملک کے درد دل رکھنے والے شخص کو بیچ اسلام سمجھتے۔ اور تو اس دور کا حکمران آئین سازی میں ایسے اسلامی اصول کو نظرانداز کر دینے پر تجھیار رہا تھا۔ اور ایوانِ اقتدار سے دھڑا دھڑ ایسا لٹریچر شائع کیا جا رہا تھا۔ کہ عورت کی صدارت اسلامی اصول کے منافی ہے۔ بہت سے لوگ جو ان فتووں کی پرچار کر رہے تھے، آج

ان ترامیم کو مسترد کرا رہے تھے۔ اور بشمول جماعت اسلامی کئی جماعتیں جو اس وقت مسئلے کا جواز ڈھونڈ رہی تھیں۔ آزاد ان ترامیم کے حق میں تھیں، اور اس حکمت عملی کا حوالہ مسز اشرف عباسی نے یہ کہہ کر دیا کہ ۱۹۶۵ء میں جماعت اسلامی نے فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی۔ قیوم لیگ کے یوسف خٹک نے بھی خواتین کی حمایت کی۔ اس دفعہ میں اگلی اصلاح اس کی اہلیت کی شرائط سے متعلق تھی جس پر چار ترمیمیں آئیں۔

مولانا عبدالحق کی ترمیم ۴۴۷ یہ تھی کہ اس دفعہ کی شق ۲ میں حسب ذیل نئی شق کا اضافہ کیا جائے کہ (صدر کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ دینی اور دنیوی علوم میں مہارت، خدا ترسی، دیانت، فرائض کی پابندی اور منکرات سے اجتناب میں عام مسلمانوں سے ممتاز ہو۔)

مولانا غلام غوث ہزاروی کی ترمیم ۴۴۹ میں کہا گیا تھا کہ (وہ عام ملکی حالات قومی سیاسیات سے باخبر ہو نیز اسلام کے احکامات کی خلاف ورزی میں مشہور نہ ہو۔) چوہدری ظہور الٰہی نے ترمیم ۴۳۱ میں کہا تھا کہ (وہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کا پابند ہو۔) مولانا محمد ذاکر نے ترمیم ۴۴۱ میں کہا تھا کہ (وہ شائستہ چال چلن کا حامل، دور اندیش ہو۔ اسلامی عقائد کا صریح مخالف نہ ہو۔)

اسلام کے نقطۂ نگاہ میں صدر کی ایسی اہلیتوں کا مقام کتنا ہی بنیادی اور ضروری کیوں نہ ہو۔ یہاں دستور نے صدر کو اسلام کا پابند بنانے سے متعلق یہ تمام ترامیم مسترد کر دیں۔

دفعہ ۴۳ کی شق ۳ میں ہے کہ صدر کا انتخاب، پارلیمنٹ کے دونوں ایوان مشترکہ اجلاس میں کریں گے۔ چوہدری ظہور الٰہی کی ترمیم تھی کہ یہ انتخاب دونوں ایوانوں کے علاوہ صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے مشترکہ اجلاس میں ہونا چاہئے۔ بھارتی آئین میں بھی صوبائی اسمبلیاں خاص تناسب سے صدر کے انتخاب کے لئے نمائندے بھیج دیتی ہیں۔ عبدالحئی بلوچ نے کہا کہ اس طرح یہ ظاہر ہوگا کہ صدر پر صوبائی اسمبلیوں کو بھی اعتماد ہے۔ احمد رضا قصوری نے کہا کہ صدر کے عدم اہلیت کے بارہ میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر وہ سزا یافتہ ہو یا صدر کے عہدہ سے معزول کیا گیا ہو۔ تو صدارت کے انتخابات میں حصہ نہ لے سکے۔ وزیر قانون نے کہا کہ یہ مقصد صدارت، رکن قومی اسمبلی بننے کی اہلیت ضروری قرار دیکر حاصل ہو جاتی ہے۔ دفعہ ۴۵ کا تعلق صدر کے حلف سے ہے۔

دفعہ ۴۴ عہدہ صدارت کی شرائط میں یہ ہے کہ وہ پاکستان کی ملازمت میں کوئی نفع بخش عہدہ نہ سنبھالے۔ مولانا انصاری کی ترمیم تھی کہ (اندرون ملک یا بیرون ملک) دونوں کی تصریح ضروری ہے۔ اس طرح یہ بھی ضروری قرار دیا جائے کہ آئندہ کیلئے ان کے سیاسی عزائم نہ ہوں تاکہ

اس کی غیر جانبداری ہر شبہ سے بالاتر رہ سکے۔ ظہور الٰہی صاحب اور انصاری صاحب کی ترمیم یہ بھی تھی کہ وہ اپنی مدت کے دوران یا اس کے بعد بھی ایسا نہ کر سکے۔

دفعہ ۴۸ اس دفعہ پر بھی معرکے کی بحث ہوئی۔ اس کا تعلق صدر کے معافی وغیرہ دینے کے اختیارات سے ہے کہ وہ عدالت کی دی گئی سزاؤں میں معافی، مہلت، التوا دے سکتا ہے۔ اسے معطل کر سکتا ہے۔ اور اس میں تخفیف بھی کر سکتا ہے۔ چونکہ شریعت اسلامی کی نظر میں ایسا کوئی اختیار صدر کو حدود، قصاص اور حقوق العباد سے وابستہ امور میں حاصل نہیں۔ اس طرح اسلام کا نظام عدل وانصاف یقیناً مجروح ہو جاتا ہے۔ حدود کی معافی اور تخفیف سے تو حضور نے بھی علانیہ معذرت ظاہر کی، مگر یہاں غیر اسلامی دساتیر کی تقلید میں صدر کو ایسی تمام سزاؤں کو یکلخت کالعدم قرار دے سکنے کا حق دیا جا رہا تھا۔ جو صریحاً اسلامی احکام سے منافی تھا۔ اس لئے بیشمار ترمیمیں اسی غرض سے داخل ہوئیں۔ مولانا عبدالحق کی ترمیم ۲۹۳ یہ تھی کہ اس دفعہ میں (اسلامی حدود اور قصاص کا استثناء ضروری ہے۔ چوہدری ظہور الٰہی کی ترمیم ۲۹۶ یہ تھی کہ (یہ اختیار قرآن وسنت اور اس سلسلہ کے قانون) کے تابع ہو۔ مفتی محمود، مولانا عبدالحق، مولانا صدر الشہید کی مشترکہ ترمیم ۲۹۷ یہ تھی کہ (ایسا اختیار حدود وقصاص اور حقوق العباد کے بارہ میں اسلام کے مقرر کردہ تعزیرات کے معاملات پر وسعت پذیر نہیں ہوگا۔) مولانا ظفر احمد انصاری کی ترمیم ۲۹۵ یہ تھی کہ صدر ایسا اختیار اسلامی مشاورتی کونسل سے اسلامی حکم معلوم کر کے استعمال کرے۔ فاروقی صاحب، شوکت حیات صاحب، نورانی صاحب، ہزاروی صاحب کی مشترکہ ترمیم ۲۹۴ میں یہ تھا کہ (جہاں اس اختیار کا استعمال قرآن وسنت کی رو سے ممنوع نہ ہو۔) محمود علی قصوری اور راؤ خورشید علی صاحب صدر کے ایسے اختیارات کو جوڈیشل کونسل کے مشورے کے تابع بنانا چاہتے تھے۔ امیر زادہ خان، عبدالحمید خان جتوئی اس دفعہ کو سرے سے حذف ہی کرنا چاہتے تھے۔

محرکین اور مخالفین نے زور دار تقریریں کیں۔ مولانا عبدالحق نے وضاحت سے اپنا موقف پیش کیا۔ کہ حدود وقصاص جیسے قطعی احکام کی نوعیت میں تبدیلی ممکن نہیں۔ مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب نے کہا کہ اس طرح سزا یافتہ مجرموں کو سیاسی اغراض سے سزائیں کم یا معاف کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جبکہ قاتل کو صرف مقتول کے ورثاء معاف کر سکتے ہیں۔ صاحبزادہ صفی اللہ نے بھی کہا کہ اسلام کے ایسے اصولوں کو وزیر اعظم یا صدر تبدیل نہیں کر سکتا۔ مفتی محمود نے حدود وقصاص کی مفصل تشریح کی اور کہا چار جرائم زنا، شراب نوشی، سرقہ، قذف کی سزاؤں میں کسی کو معافی یا تخفیف کا حق

نہیں۔ اور قصاص ورثاء کی مرضی پر ہے نہ کہ حکومت کی۔ نیپ کے امیرزادہ خان نے کہا کہ جب مکمل عدالتی تحقیقات اور تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد سزا دی گئی ہے۔ تو ایک حاکم کسی انتظامی حکم کے ذریعہ اسے کیسے کالعدم کر سکتا ہے۔ ملک محمد اختر اور ملک محمد جعفر نے کہا ان اختیارات کا مقصد کسی ممکنہ عدالتی غلطی کو درست کرنا ہے۔ مگر راؤ خورشید علی نے کہا کہ کیا اس اختیار کے استعمال میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کم از کم جوڈیشنل کونسل سے مشورہ تو ضروری ہونا چاہئے۔ خان عبد القیوم خان نے ترمیمات کی مخالفت میں سرکاری ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ حزب اختلاف شک و شبہ کی بناء پر ترمیمات پیش کر رہی ہے۔ اقلیت کو اکثریت پر رائے ٹھونسنے کا کوئی حق نہیں۔ (اور یہ وہ ہتھیار تھا۔ کہ جہاں بھی مخالفانہ موقف کا معقول جواب نہ ہوتا۔ خان صاحب اور بعض دیگر سرکاری ارکان کی زنبیل سے نکل آتا) خان صاحب نے اس پر بس نہیں کی۔ بلکہ کہا کہ بعض ارکان نے ہر ہر دفعہ میں قرآن و سنت کی قید لگانا فیشن بنا لیا ہے۔ ان کی پارٹی کے رکن عنایت الرحمن عباسی نے پھر بھی انصاف کا مظاہرہ کیا۔ اور کہا کہ سزاؤں میں تصرف قرآن و سنت کی روشنی میں ہونا چاہئے۔ مگر آگے ایک عجیب ارشاد ہوا کہ کیا اس وقت عدالتی فیصلے قرآن و سنت کی بنیاد پر ہو رہے ہیں۔ کہ اس جمہوری شق کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ گویا وہ بھول گئے کہ یہ آئین آئندہ کے لئے بنایا جا رہا ہے۔ موجودہ نظام عدالت کو برقرار رکھنے کے لئے نہیں۔

ملک اختر نے سرکاری ترجمانی کرتے ہوئے دنیا کے ۵۰ ایسے دساتیر کی مثالیں اپنی تائید میں پیش کیں۔ جن میں ایسے اختیارات موجود ہیں۔ مگر کاش کہ وہ کتاب و سنت سے بھی کوئی حوالہ پیش کر سکتے۔ قرآن و سنت کے مطابق آئین سازی کے مقابلہ میں دنیا کے دساتیر، دنیا کی رسومات، دنیا کے علماء کے حوالے پیش کرنا تو ایوان میں ایک عام سی بات ہو گئی تھی۔ اس آرٹیکل میں اپوزیشن کی تمام ترامیم مسترد ہو گئیں۔ اور یہ دفعہ ۸۰ ووٹوں سے منظور ہو گیا۔

دفعہ ۴۵ | اس میں کہا گیا ہے کہ صدر کو جسمانی، دماغی نااہلیت یا آئین کی خلاف ورزی یا سنگین غلط روی کے الزام میں برطرف کیا جا سکے گا۔ اگلی آٹھ ذیلی دفعات میں برطرفی کے طریق کار کا ذکر ہے۔ مولانا عبد الحق صاحب نے اصل دفعہ میں یہ ترمیم ۴۸ کرانی چاہی کہ جسمانی یا دماغی یا (اخلاقی نااہلیت کی بنیاد پر جس میں وضع کئے گئے معتقدات اور نظریات بدل دینے پر یا نظریۂ پاکستان کی مخالفت میں شہرت پا لینے پر۔ الخ) بھی برطرف کیا جا سکتا ہے۔ اگلی ترمیم ۴۹ میں مولانا عبد الحق صاحب نے اس ترمیم کی تشریح فرمائی تھی۔ کہ (اس شق کی اغراض کے لئے اگر کوئی شخص مسلمان نہ ہے

یا دفعہ ۵ میں مذکورہ حلف نامہ میں محولہ کسی بھی عقیدہ کی خلاف ورزی کرے۔ تو وہ اعتقادی نااہلیت کا سزاوار ہوگا۔)

مولانا عبدالحق نے اپنی تقریر میں کہا کہ جہاں ہم جسمانی، ذہنی اور دیگر باتوں میں عدم اہلیت کی وجہ سے اسے برطرف کر سکتے ہیں۔ تو اعتقادی خرابی کو بھی اس دفعہ میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ تاکہ ہٹانے کے لئے دیگر جوازوں کے ساتھ دین سے منحرف ہونے یا حلف کے تقاضوں سے منحرف ہونے پر بھی اسے ہٹایا جا سکے۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے مولانا عبدالحق کی ترمیم کی تائید کی اور کہا کہ اگر اسے دفعہ میں شامل نہ کرایا گیا۔ تو اس حلف کا کیا فائدہ رہے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ مسلمان کی شرط بھی لغو ہو جائیگی۔ اگر حلف میں اعتقادات کا ذکر نہ ہوتا۔ تو اس ترمیم پر زور نہ دیا جاتا۔ اب جب یہ چیز حلف میں شامل کردی گئی تو برطرفی کے لئے بھی اسے یہاں شامل کرنا ضروری ہے۔ نہ صرف یہ ترمیم بلکہ اس دفعہ میں برطرفی کے مجوزہ طریق کار کے بارہ میں بھی تمام ترامیم مسترد ہوگئیں اور دفعہ منظور ہوگئی۔

دفعہ ۴۸: اس دفعہ میں ہے کہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں صدر وزیر اعظم کے مشورہ اور اس کے مطابق عمل کرے گا۔ اور وہ ایسے مشورہ کا پابند ہوگا۔ نیز صدر کے احکامات تب باضابطہ ہونگے کہ اس پر وزیر اعظم کے دستخط ہوں۔

اس دفعہ میں زیادہ تر ترمیمات کا مقصد بھی اسے اسلامی اور جمہوری بنانا تھا۔ چوہدری ظہور الہی کی ترمیم تھی کہ صدر قرآن و سنت اور آئین کے دیگر احکامات کے تابع اپنے فرائض کی انجام دہی میں الخ مولانا ہزاروی صاحب، پروفیسر غفور صاحب وغیرہ کی مشترکہ ترمیم اور انصاری صاحب، جتوئی صاحب، قصوری صاحب کی ترمیمیں یہ تھیں کہ جہاں آئین نے صدر کو اپنی صوابدید پر عمل کرنے کا اختیار دیا ہو وہاں وہ پابند نہ ہوگا۔ تالپور صاحب، سومرو صاحب، میاں محمود علی صاحب اور خورشید علی صاحب کی ترمیمیں یہ بھی تھیں کہ صدر وزیر اعظم کی بجائے وفاقی حکومت کے مشورے کا پابند ہونا چاہئیے۔ مفتی محمود صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب کی مشترکہ ترمیم میں ۴۸ میں اصل دفعہ کی مخالفت تو نہیں کی تھی۔ البتہ انہوں نے ترمیم کے ذریعہ یہ اضافہ کرانا چاہا تھا کہ (الا یہ کہ صدر آئین کے احکام کی پابندی کے سلسلہ میں وزیر اعظم سے مواخذہ کر سکے گا۔) صدر کے احکام کی بابت مطلق وزیر اعظم کے دستخطوں پر موقوف رکھنے کی بھی ترمیمات ۳۱ سے لیکر ۴۵ تک مخالفت کی گئی تھی۔ اور سب میں اسی کے حذف یا تبدیلی پر زور دیا گیا تھا۔ ایک ترمیم یہ تھی کہ صدر وزیر اعظم کا مشورہ تب قبول کرے جب وہ قرآن و سنت کے مطابق ہو۔ مولانا عبدالحق اور مفتی محمود صاحب نے یہ مطالبہ فرمایا۔ کہ صرف ایسے مشورے سے قبول ہوگا جو کتاب و

سنت کے مطابق ہوں۔

مولانا عبدالحق صاحب نے اپنی ترمیم پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ایک طرف تو ہم صدر کو اسلامی حدود سزاؤں اور صریح احکام میں دست اندازی کا حق صرف اس بنیاد پر دیتے ہیں۔ کہ دیگر اقوام کے ہاں ایسا ہو رہا ہے۔ جبکہ ہمارا ملک اور آئین اسلامی ہے۔ یہاں بالادستی خدا اور رسول کو ہے۔ مگر ہم صدر کو ان احکامات کے بدلنے کا اختیار دینے سے بھی نہیں شرماتے۔ لیکن یہاں ہم صدر کو اتنا پابند بناتے ہیں کہ وہ محض وزیراعظم کا پی۔اے بن جائے۔ صدر ڈکٹیٹر نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ ہر بات میں وزیراعظم کے رحم وکرم پر رہ جائے۔ تو بالواسطہ صدارت بھی اسی پارٹی کے تمام تر مفادات میں محصور ہو کر رہ جائے گی جس پارٹی کو وزارت عظمیٰ حاصل ہے۔ دونوں ایک پارٹی کے حقوق کے محافظ ہو جائیں گے ... جبکہ دوسروں کو حق تلفی سے بچانے کے لئے صدر کا غیر جانبدار ہونا ضروری ہے۔ اس لئے پارلیمانی نظام کی بناء پر اگر اختیارات وزیراعظم کے پاس رکھنا ہی ہیں، تو صدر کو یہ حق تو دینا چاہیئے۔ کہ آئین کی خلاف ورزی کی صورت میں وہ وزیراعظم سے محاسبہ کر سکے گا۔ دفعہ کی لفظی اصلاح کرتے ہوئے مولانا عبدالحق نے کہا کہ یہاں مشورہ کا لفظ بھی موزوں نہیں۔ کیونکہ مشورہ کی پابندی لازمی نہیں ہوتی۔ تو مشورہ اور عمل اس کی پابندی اجتماع ضدین ہے۔ اگر دفعہ رکھنا ہی ہے تو صرف اتنا کافی ہے کہ صدر وزیراعظم کے احکام کا تابع ہوگا۔

ظہور الٰہی صاحب، احمد رضا صاحب نے بھی صدر کو دستخطوں کا پابند بنانے کی مخالفت کی اور کہا اس طرح تو صدر موہنجوڈارو کی سٹوپا کی طرح ایک چیز بن جائیگا۔ مولانا عبدالحکیم نے کہا کہ اس طرح صدر کے عہدے کا وقار گرے گا۔ پروفیسر غفور نے کہا کہ منتظم اعلیٰ وزیراعظم ہی رہتا ہے۔ مگر اسے کابینہ کے مشورے پر کام کرنا چاہیئے۔ مفتی محمود نے کہا کہ اگر وزیراعظم ملکی سلامتی کے تحفظ میں ناکام ہو جاتے تو صدر کو اپنے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ بزنجو اور علی اللہ تالپور چاہتے تھے۔ کہ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ وزیراعظم کو مسلح افواج کی تقرریاں، سپریم کورٹ کے جج اور الیکشن کمشنر مقرر کرنے کا اختیار نہیں ہونا چاہئے اس مرحلہ پر خان عبدالقیوم خان نے آئینی سمجھوتہ کا حوالہ دیا۔ بزنجو نے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ تمام اسٹیٹ پاورز وزیراعظم کو تفویض کی جائیں۔

پیرزادہ صاحب نے اس تمام بحث کے جواب میں کہا۔ کہ یہ لوگ وزیراعظم، منتخب نمائندہ (وزیراعظم) کی بجائے غیر منتخب شخص (صدر) کو اختیارات دینا چاہتے ہیں۔ اور اس دفعہ کی مخالفت حسبِ عمل کی بجائے بعض مفاد پر ہے۔ رائے شماری ہوئی اور دفعہ ۵۰ دونوں سے منظور ہو گئی۔

دفعہ ۵۲ اس دفعہ میں یہ ہے کہ صدر کا عہدہ خالی ہوجانے کی صورت میں سینٹ کا چیرمین یا قومی اسمبلی کا سپیکر قائم مقام صدر ہوگا جب تک نئے صدر کا انتخاب نہیں ہوتا ۔ کلیدی مناصب کے لئے ویسے بھی مسلمان ہونا ضروری ہے۔ پھر جبکہ عہدہ ایسا ہو کہ اس پر فائز شخص بطور نیابت صدارت کے عہدہ پر بھی فائز ہو سکے جس کے لئے مسلمان ہونا لازمی شرط مان لی گئی ہے۔ اسلئے یہاں مولانا عبدالحق کی ترمیم ۵۲۷ یہ تھی کہ چیرمین اور سپیکر کے ساتھ لفظ مسلمان درج کیا جائے مگر صدر دستوریہ نے مشورہ دیا کہ اس ترمیم کو سپیکر سے متعلق دفعہ ۵۶ پر ملتوی کر دیں دوسرے دن مولانا نے تحریک استحقاق پر کہا کہ اخبارات نے اسی ترمیم کی واپسی کا تاثر دیا ہے۔ جبکہ میں کسی ایسی ترمیم کو ہرگز واپس نہیں لوں گا۔ جس کا مقصد اسلامی اصولوں پر عمل درآمد کرانا ہو۔ چاہے ایوان اسے رائے شماری میں مسترد کر دے۔

باب دوم

پارلیمنٹ

اس باب کا تعلق قومی اسمبلی، سینٹ کی تعداد ارکان، اہلیت انتخاب، میعاد اسمبلی سپیکر، ڈپٹی سپیکر، اجلاس طلب کرنا، رائے شماری کورم، قومی اسمبلی کا توڑنا، سینٹ، چیرمین اور ارکان یا پارلیمنٹ کے بارہ میں تصریحات سے ہے۔

دفعہ ۵۳ یہ پہلی دفعہ ہے۔ اس میں عبدالحئی بلوچ نے کہا کہ لفظ سینٹ کی جگہ قومیتوں کا ایوان ہونا چاہئے۔ تاہم انہوں نے ترمیم واپس لی۔

دفعہ ۵۴ اس دفعہ کی شق ۱ کے بارہ میں فاروقی صاحب پروفیسر غفور صاحب، شوکت حیات صاحب، تورانی صاحب، مزاری صاحب، چوہدری ظہور الٰہی صاحب کی ترمیم میں جداگانہ انتخابات کی بنیاد پر زور دیا گیا تھا۔ اس دفعہ کے آخر میں عورتوں کے لئے دس مخصوص نشستیں محفوظ کرنے کا ذکر تھا۔ مولانا عبدالحق صاحب نے اپنی ترمیم ۵۵۳ میں عورتوں کی ایوان میں نمائندگی کی سرے سے مخالفت کرتے ہوئے اس دفعہ کی شق ۲ کو حذف کرنے پر زور دیا برطانوی اثرات اور مغربی تہذیب کے تسلط سے یہ بات کتنی ہی عجیب کیوں نہ لگے۔ مگر ایک اسلامی مملکت جس کا سرکاری مذہب اسلام ہو۔ آئین کو اسلامی کہا جا رہا ہو۔ اس کے بارہ میں اسلامی

نقطۂ نظر کی ترجمانی بہرحال ضروری تھی۔ اسلام کے نظام خلافت وحکومت میں کہیں بھی عورتوں کا اس کھلے بندوں بے حجابانہ طور طریقوں کے ساتھ مجالس مشاورت میں شمولیت کو تحسین کی نظروں سے نہیں دیکھا گیا، اس لئے اسلامی موقف پیش کرنا ایسے ہر موقع پر ضروری سمجھا گیا اگر ہمیں مغربی تہذیب سے مرعوب ہوکر ایسی باتوں میں احساس کمتری میں مبتلا ہونا تھا تو اسلام کے نام پر ایک علیحدہ سٹیٹ بنانے کی ضرورت نہ تھی۔

مگر جب ہم اپنے ملک، اپنے آئین، اپنی اسمبلی کو اسلامی کہیں گے تو ایسی تمام باتوں میں مغربی رائے عامہ سے مرعوب نہیں بلکہ جرأت مندانہ طور پر اسلام کے حقیقی تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ بہرحال اسی دفعہ میں مولانا عبدالحق اور دیگر تمام محرکین کی ترامیم بائیکاٹ کے دوران ساقط ہوگئیں۔ مگر جب مولانا غلام غوث ہزاروی کی ترمیم ۵۳۶ زیر بحث آئی اور جس میں آپ نے کہا تھا کہ اگر عام انتخابات میں مرد اور عورتیں برابر کی امیدوار ہوسکتی ہیں، تو پھر مخصوص اور محفوظ نشستوں کی ضرورت نہیں۔ اس ترمیم پر بحث میں مولانا عبدالحق کے موقف کی ترجمانی بھی بعض ارکان کی زبانی ہوگئی۔ مولانا ہزاروی نے اس بحث میں اپنی ظریفانہ طبیعت کا خوب خوب مظاہرہ کیا اور کہا اب تک عورتیں اپنے استحصال کا واویلا کرتی تھیں مگر اس طرح تو مردوں کا استحصال ہورہا ہے۔ اگر انہیں یہ محفوظ نشستیں دی جارہی ہیں تو پھر عام انتخابات میں مردوں کے ساتھ انہیں ٹوٹ کر کے ایک ایک مرد ووٹر کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔

بیگم نسیم جہاں نے عورتوں کی ترجمانی کی اور کہا کہ قائداعظم نے پہلی بار ہمیں مخصوص نشستیں دیں ۱۹۴۶ء میں عورتوں نے عام انتخابات میں حصہ لیا۔ اس طرح عام انتخابات کے ساتھ محفوظ نشستوں کا اصول بھی تسلیم کیا جاتا رہا۔ حاکم علی زرداری اور پی پی پی کے دیگر ارکان عباس گردیزی، خورشید حسن میر، نرگس نعیم نے بھی عورتوں کی وکالت کی اور عورتوں کے ساتھ ظلم کا رونا رویا۔

جناب علی حسن منگی نے کہا کہ ان سیٹوں میں تو مزید اضافہ بھی ہونا چاہیے۔ زرداری نے کہا کہ مجھے ایوان میں خواتین کے خلاف ترامیم سے دکھ ہوتا ہے۔ گردیزی صاحب نے عورت پر اسلام کے احسانات کا ذکر کرکے زور دیا کہ اب پارلیمنٹ میں بھی اس کی رعایت ضروری ہے۔

میر صاحب نے افسوس ظاہر کیا کہ ہماری سوسائٹی اور پارٹیاں اپنے فرائض نہیں پہچان سکیں ورنہ عورتوں کو عام انتخابات میں بھی منتخب کیا جاتا۔ ہزاروی صاحب نے جوابی تقریر میں کہا کہ خوشی ہے کہ پہلی مرتبہ ایک خاتون نے تسلیم کیا کہ عورت محکوم ہے، شوہر حاکم یہی قرآن کریم کا موقف ہے۔ الرجال

قوامون علی النساء۔ مرد حاکم بھی ہے، محب بھی ہے۔ خاتون محکوم ہے مگر محبوب بھی ہے مگر زیادہ زن مرید شخص مردوں میں شمار نہیں ہوتا۔ انہوں نے مزید کہا ہم عورتوں کو مشورہ میں شریک کرنے کے مخالف نہیں مگر یہ ہے۔ خاتون خانہ ہو گی نہ ہو۔

اگر انہیں جنرل الیکشن میں حصہ لینے پر اصرار ہے تو مجھے کیا۔ یہ مخربات سو فیصد بھی کامیاب ہو جائیں اور پورا ہال "زنانہ اسمبلی ہال" بن جائے تو مجھے کیا اعتراض ہے۔ مگر یہ تو ظلم ہے کہ ادھر عام انتخابات میں بھی اور ادھر مخصوص نشستوں کی شکل میں بھی اسے دوہرا موقع دیا جا رہا ہے۔ اگر عورت بے حیائی کا پتلا بنتی ہے، محفلوں کی رانی بنتی ہے تو اسلام اسے کبھی بھی اسکی اجازت نہیں دیتا اسی بحث میں حصہ لیتے ہوئے ڈپٹی سپیکر جناب حنیف خان صاحب نے ایک طرح مولانا عبدالحق صاحب کی ترمیم کی ترجمانی کی اور کہا کہ مجھے آپ رجعت پسند کہیں مگر میں عورتوں کے انتخاب کا مخالف ہوں۔ اپنے طور پر اسلام کے مطالعہ کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ اس میں عورت کو مجلس شوریٰ کا ممبر یا سربراہ مملکت ہونے کا اختیار نہیں دیا گیا ہمارے ملک میں تو عورتوں کے انتخابات میں بحیثیت ووٹر کے حصہ لینے سے بھی دھاندلی ہوتی ہے جس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے انکی رائے پر تنقید ہوتی، مگر خان قیوم صاحب جو ان کے پارٹی لیڈر تھے پر تو یہ بات بڑی ناگوار گذری اور انہوں نے یہ کہتے ہوئے سجدہ سہو ضروری سمجھا کہ معلوم نہیں خان حنیف خان اس حد تک کیوں گئے ۔۔۔ مگر میری پارٹی تو عورتوں کو اس طرح کے حقوق دلانے میں پیش پیش رہے گی۔

پیرزادہ صاحب وزیر قانون نے بحث ختم کراتے ہوئے کہا کہ عورتوں کا جنرل الیکشن میں حصہ لینا بہت سی سیٹوں پر منتخب ہونا تو ہمارا منشور ہے۔ پی پی پی نے ان حسین خوابوں کو سامنے رکھا ہے۔ کہ مرد و عورت کو برابر کر دیا جائے مگر ملکی حالات اور واقعات اس بارے میں ناسازگار ہیں یعنی معاشرہ نے اتنی ترقی ابھی تک نہیں کی، انہوں نے نسیم جہاں کی اس تجویز کی بھی مخالفت کی کہ عورتوں کو عورتیں ہی عام انتخاب کے ذریعہ منتخب کریں۔ اور کہا کہ اس طرح دو عملی ہو گی۔ بہرحال مولانا ہزاروی کی ترمیم پر ووٹنگ ہوئی، جب اختلاف ہاؤس سے مقاطعہ کر چکی تھی۔ مولانا کو ایک ہی ووٹ یعنی صرف اپنا ووٹ ملا، ترمیم مسترد ہو گئی۔ اور یہ حزب اقتدار کی بے دردی اور کم حوصلگی کی سب سے بڑی علامت تھی کہ جن مولانا ہزاروی نے پورے حزب اختلاف کی خفگی مول لی تھی اُسے آج دو چار کی حمایت بھی نہ دلا سکی اور وہ بوجھ سے کاروان رستے۔

اس واقعہ نے سرکاری اور غیر سرکاری بہت سے ارکان کی تسکین یہ حقیقت کہ ووٹ کی مرنجانے

اکیس سال کے اختیار کر دیا جائے جسے مفاہمت کے نتیجہ میں قبول کر لیا گیا۔ اس دفعہ کی شق ۲ میں قبائلی علاقوں کی نشستیں پر کرنے کا طریق کار صدر پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس طرح وہاں کے عوام کی مرضی کے بغیر اور بالغ رائے دہی کے طریق کار کو چھوڑتے ہوئے سلیکشن کے ذریعہ ایسے افراد نامزد کر کے آجاتے ہیں جو عوام کے سامنے تو اسلام کے لئے لڑ مرنے کا حلف اٹھا اٹھا کر اسمبلی میں آجاتے ہیں، لیکن یہاں آکر وہ حکومت کے لئے ترپ کا پتہ ثابت ہو جاتے ہیں۔ موجودہ اسمبلی کے اکثر قبائلی ارکان بھی ضرور یہ لاکھ دیندار اور متدین بھی انہوں نے اپنے عوام سے بھی اسلامی دفعات اور ترمیمات پر علماء کی حمایت کے وعدے کئے تھے۔ اور شاید دل سے چاہتے بھی تھے۔ مگر کسی ایک ترمیم میں بھی انہیں سرکاری بنچوں کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہو سکی: بے چارہ "نامزدگی" کی بدولت اتنے مجبور و بے بس تھے کہ اپنے عوام، اپنے ضمیر اور ملکی جمہوری، اسلامی تقاضوں کی رعایت کرتے کسی موقعہ پر بھی انہیں نصیب نہ ہو سکی۔ یہ اسی طریقہ انتخابات کا نتیجہ تھا جسے نئے آئین میں بھی تحفظ دیا گیا۔

مفتی محمود صاحب، مولانا عبدالحق کی مشترکہ ترمیم ۵۵۲ میں کہا گیا تھا کہ اس طریق کار سے متعلق ذیلی دفعہ ۲ حذف کر دی جائے۔ مزید کئی ایک ترامیم میں ارکان نے قبائلی علاقوں کیلئے انتخابی طریق کار وضع کرنے کا حق صدر کی بجائے قومی اسمبلی کو دینے پر زور دیا تھا۔ مخصوص قبائلی نشستوں کے علاوہ خواتین کی ریزرو سیٹوں کی تقسیم سے بھی توازن قائم نہیں رہتا اس لئے حزب اختلاف کی ترامیم میں تھا کہ ہر صوبے کیلئے کم از کم ایک نشست مخصوص کرانا ضروری ہے اور جہاں زیادہ خاتون ارکان کا انتخاب کرنا ہو۔ یہ انتخاب واحد ناقابل انتقال ووٹ کے ذریعہ متناسب نمائندگی کے طریق کار کے مطابق ہوگا۔

پی پی پی کے ناصر علی شاہ، افضل رندھاوا صاحب، چوہدری برکت اللہ صاحب نے اسمبلیوں میں اقلیتی فرقوں کے لئے بھی نشستیں مخصوص کرنے پر زور دیا۔ وہ ارکان جو اسمبلی کے ارکان کیلئے مسلمان اور دیانتدار ہونے کی ترمیم کی زور شور سے مخالفت کر رہے تھے آج ان ترامیم کے حق میں بول رہے تھے۔ مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ جب جنرل الیکشن کا دروازہ بلا امتیاز مذہب سب کے لئے یکساں چھوڑ دیا گیا تو اس طرح ریزرویشن کروا کر غیر مسلموں کے ہاتھوں مسلمانوں کا دوہرا استحصال نہیں ہوگا وہ تو اچھا ہوا کہ اقلیتی فرقہ کے راجہ تری دیو رائے صاحب نے خود ان کی مخالفت کی اور یہ ترمیم واپس کروا دی گئیں ——

دفعہ ۵۵ | قومی اسمبلی کی میعاد کے بارے میں ہے کہ اگر وہ اس سے قبل نہ توڑی جا چکی ہو تو اپنے پہلے اجلاس کے لئے مقرر کردہ دن سے پانچ سال تک برقرار رہے گی اور اپنی میعاد کے اختتام پر ٹوٹ جائے گی۔ اس میں راؤ خورشید علی، محمود علی قصوری، عبدالحمید جتوئی، احمد رضا قصوری وغیرہ کی ترمیمیں یہ تھیں کہ الفاظ "اگر وہ اس سے قبل نہ توڑی جائے" اس طرح تبدیل کئے جائیں کہ اگر اسمبلی خود اپنی منظور کردہ قرارداد کے ذریعہ اس سے قبل خود کو نہ توڑ سے۔ حزب اختلاف کے مشترکہ گروپ کی ترمیم میں پانچ سال کی بجائے چار سال درج کرنے کا ذکر تھا۔ اور ظفر انصاری صاحب کی ترمیم میں تین سال کا ——

دفعہ ۵۶، ۵۷، ۵۸ | اس کا تعلق قومی اسمبلی کے سپیکر اور ڈپٹی سپیکر سے ہے مولانا عبدالحق مدظلہ کی ترمیم ۶۰ اور مفتی محمود، مولانا عبدالحق، مولانا صدر الشہید کی ترمیم ۵۹ میں مشترکہ طور پر سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کے عہدہ کو مسلمان سے مقید کرانے پر زور دیا گیا تھا۔ یہاں سپیکر صاحب کے حسب وعدہ مولانا عبدالحق نے اپنی ملتوی شدہ ترمیم پیش کی اور کافی بحث (جو مشمولۂ الحق ہے) کے بعد سپیکر نے ترمیم مسترد کر دی۔ مولانا کا اصرار تھا کہ جب وہ صدر کا قائم مقام ہو سکتا ہے جس کے لئے مسلمان ہونا ضروری شرط ہے تو نائب کو بھی اس شرط کا پابند بنا دینا چاہیئے۔ ورنہ اسلامی سلطنت کے سب سے بڑے کلیدی منصب کا چند دنوں کے لئے بھی غیر مسلم کے پاس جانا ملکی مفاد کے خلاف ہوگا۔ دفعہ ۵۹ پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کرنے کے بارہ میں ہے۔ کہ قومی اسمبلی کے ایک چوتھائی تعداد کے طلب کرنے پر بھی اجلاس طلب کیا جا سکے گا۔ جناب امیر زادہ خان، عبدالحمید جتوئی، محمود علی قصوری، راؤ خورشید علی کی ترمیم میں ایک چوتھائی کی بجائے ۱/۵ پر زور دیا گیا تھا، چوہدری ظہور الٰہی کی ترمیم میں کم از کم چالیس کا ذکر تھا۔ اسی طرح دفعہ ۶۰ میں رائے شماری اور کورم کی تعداد ۱/۴ کی بجائے لفظ تیس پر زور دیا گیا تھا۔

دفعہ ۶۱ | قومی اسمبلی کو توڑ دینے کا مسئلہ سراسر وزیر اعظم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے اس بارہ میں کئی اہم ترامیم تھیں، ظفر احمد انصاری، راؤ خورشید، قصوری صاحب یہ اضافہ کرانا چاہتے تھے کہ اسمبلی کے ارکان کی اکثریت کو بھی قومی اسمبلی توڑ دینے کا حق دینا چاہیئے۔ مولانا مفتی محمود مولانا عبدالحق کی ترمیم ۱۷۵ میں صدر اور وزیر اعظم کے ایسے اقدام کو اسی طرح مشروط کرنا چاہتے تھے کہ جب قومی اسمبلی میں حزب اقتدار و اختلاف کی تعداد مساوی ہو اور اسمبلی اپنے مفوضہ امور کی انجام دہی میں مکمل طور پر ناکام ہو جائے۔ بزنجو صاحب کی ترمیم تھی کہ اگر صدر وزیر اعظم کے مشورہ پر اس صورت میں اسمبلی توڑ سکے گا

اگر وزیر اعظم نے اسمبلی میں اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا ہو ۔۔۔۔ فاروقی صاحب، مولانا نورانی صاحب، شوکت حیات، شیر باز مزاری کی ترمیم تھی کہ جب وزیر اعظم کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک اسمبلی میں زیر غور ہو تو وہ بلا مشورہ نہیں دے سکے گا۔ امیر زادہ خان صاحب کی ترمیم میں تھا کہ اسمبلی کے اسے توڑ دینے کی صورت میں وزیر اعظم خود بھی اپنا عہدہ خالی کر دے۔

دفعہ ۶۲ سینیٹ کے بارہ میں ہے۔ پی پی پی کے ناصر علی شاہ، محمد فضل رند صاوا، چوہدری برکت اللہ ہر صوبے سے سینیٹ میں اقلیتی فرقوں (غیر مسلموں) کے ایک رکن کو نمائندگی دینا چاہتے تھے۔ عبدالخالق خان صاحب کی ترمیم تھی کہ سینیٹ میں ہر صوبے کی چار نشستیں کسانوں اور مزدوروں کے لئے مختص ہونی چاہئیں۔

دفعہ ۶۳ سینیٹ کے چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین سے متعلق ہے۔ اس دفعہ میں بھی مفتی محمود صاحب اور مولانا عبدالحق کی مشترکہ ترمیم ۶۰۳ یہ تھی کہ ایسے چیئرمین کا مسلمان ہونا لازمی ہے۔ جبکہ وہ صدر کی غیر موجودگی میں قائم مقام صدر ہو سکتا ہے۔

دفعہ ۶۵، ۶۶ ان دفعات میں پارلیمنٹ کے ارکان کی اہلیت اور نا اہلیت سے متعلق امور کا ذکر ہے۔ مولانا عبدالحق کی ترمیم ۶۰۹ میں کہا گیا تھا کہ دفعہ ۶۵ کے ذیلی الف، کے بعد رکن کی اہلیت کے لئے اس نئے پیراگراف کا اضافہ کیا جائے۔ ب۔ بجز اس کے کہ وہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے یا پاکستان کے نظریاتی اساس مذہب اسلام کی مخالفت میں بری شہرت نہ رکھتا ہو۔

مولانا عبدالحق صاحب نے اپنی تحریک میں بڑی شد و مد سے اس شرط کے اضافہ پر زور دیا۔ مگر سپیکر صاحب اس بات پر مصر تھے کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ کیا ہم علماء سے کسی کے کردار کے بارہ میں فتوے لیں گے۔ یہ کبھی متفق نہیں ہو سکتے۔ مولانا عبدالحق فرماتے تھے کہ کئی دیگر شرائط اہلیت جب معلوم کی جا سکتی ہیں تو کسی رکن کا زانی شرابی، سود خوار ہونا، قاتل ہونا، اور بدکرداری میں شہرت یافتہ ہونا کیوں اتنی مبہم بات ہے کہ اس کا علم ہی نہ ہو سکے۔ مولانا نے کہا کہ جب اسلام کی بات آتی ہے تو وہ کیوں اخلاقی نظر آنے لگتی ہے۔ اور اگر الیکشن افسران دیگر اعتراضات پر کاغذات مسترد کرا سکتے ہیں۔ عدالتیں فیصلے کر سکتی ہیں تو ایک شہرت یافتہ مسلمہ بدکردار شخص کو ابتداء ہی سے پارلیمنٹ سے روکنے کی کارروائی کیوں نہیں کی جا سکتی۔ مگر سپیکر صاحب نے یہ دے کے بعد اس ترمیم ہی کو "نامعقول" قرار دے کر مسترد کر دیا۔ مگر ایسی "نامعقول" ترمیمیں دیگر ارکان کی بھی تھیں، مگر جب یہ مسترد ہو گئیں تو باقی سب بھی ساقط ہو گئیں۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے ترمیم ۶۰۰ میں کہا تھا کہ رکن تب انتخاب کی اہلیت

رکھے گا۔ کہ وہ ملکی معاملات سے واقف ہو، بدکردار نہ ہو، اسلام کے احکام کی خلاف ورزی، میں شہرت نہ رکھتا ہو۔ مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری، مولانا محمد علی رضوی مولانا ذاکر صاحب نے ترمیم میں کہا تھا کہ وہ مسلمان ہو، ایماندار ہو، اسلامی احکام کا صریح مخالف نہ ہو اور مذہب کا ضروری علم رکھتا ہو۔ نااہلیت کے ضمن میں بھی یہ حضرات یہ اضافہ کرانا چاہتے تھے۔ کہ اگر مسلمان ہونے کی صورت میں اسلام کے مقتضیات کی تعمیل سے انکار کر دے یا کتاب وسنت کے مقررہ حدود کھلے بندوں توڑ دے یا معتقداتِ اسلام کی خلاف ورزی کی وجہ سے مسلمان نہ رہے۔ راؤ خورشید علی صاحب میاں محمود علی صاحب اس میں اخلاقی بے راہ روی کی وجہ سے سزا یافتہ ہونے کا ذکر بھی بڑھانا چاہتے تھے۔ مگر چیف الیکشن کمشنر کی رائے میں کوئی نااہل قرار پائے تو رکنیت چلی جائے گی۔ نورانی صاحب اور سردار شوکت حیات وغیرہ کی مشترکہ ترمیم اور مولانا عبدالحق کی مستقل ترمیم یہ تھی کہ اس صورت میں عدالتِ عالیہ میں استغاثہ کا حق ملنا چاہئے مولانا ازہری مولانا محمد علی صاحب مولانا محمد ذاکر کی ترمیم یہ تھی کہ ایسے کسی فیصلے میں الیکشن کمشنر اسلامی کونسل سے مشورہ لیا کرے۔

عوامی نمائندہ کے فاسق نہ ہونے اور دینی معیار پہ پورا اترنے سے متعلق مولانا عبدالحق کی اس ترمیم پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی نے کہا کہ سوال یہ ہے کہ یہ فیصلہ کون کرے گا۔ کہ رکن اسمبلی اس معیار پہ پورا اترتا ہے یا نہیں مولانا نے کہا کہ میں علماء کرام کی اس خواہش کی قدر کرتا ہوں جس کا اظہار وہ آئین کے زیادہ سے زیادہ اسلامی بنانے کے لئے کر رہے ہیں دراصل مغربی اور اسلامی طرزِ سیاست میں پیدا شدہ تضادات کو دور کرنے کی وجہ سے علماء یہ کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اصلاح کا جمہوری طریقہ یہ ہے کہ نیچے سے اوپر تک اصلاح کی جائے۔ جمہوری معاشرہ کی مثال دودھ جیسی ہے اگر دودھ زہریلا ہو تو مکھن صاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن افسوس کہ علماء میں سے بعض معاشرے کی اصلاح کا کٹھن کام نہیں کرنا چاہتے اور مختصر راستے اصلاح کے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ یہ حضرات عوامی نمائندہ کے لئے جو شرائط پیش کر رہے ہیں اس معیار پہ اسے کون پرکھے گا، انہوں نے کہا میں علماء کا ادب کرتا ہوں۔ مولانا عبدالحق کی دل سے قدر کرتا ہوں اور مولانا مفتی محمود مولانا ہزاروی سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ حق ان علماء کرام کو دیا جائے جنہوں نے "مساواتِ محمدی" کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں کو فاسق و فاجر ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ کیا عبدالمصطفیٰ جیسا نام رکھنا اسلام میں جائز ہے۔ مولانا نے کہا کہ کیا علماء رکن پارلیمنٹ کی اہلیت کے معیار پہ متفق ہو سکیں گے (اور مسلمان کی تعریف کے چیلنج کی طرح آج ان ترامیم کے حق میں بھی مختلف مکاتبِ فکر اہلیت کے معیار پہ متفق تھے۔ مگر مولانا

آج بھی اپنے اس مخصوص استدلال [علماء کے باہمی اختلاف] سے ترمیم کی مخالفت فرما رہے تھے) صدر دستوریہ نے بھی ترمیم کے بارہ میں محرک مولانا عبدالحق کو یہ کہہ کر وضاحت سے روک دیا کہ متنازعہ نوعیت کی ترمیم نہیں پیش کرنی چاہئے۔

دفعہ ۶۷ تا ۹۱ اس کے بعد ایوان کے ضابطہ کار قانون سازی، بجٹ، مالیاتی طریق کار کے بارہ میں دفعات ہیں اس کے بارہ میں معقول ترمیمات پیش ہوئیں۔ بجٹ کے متعلق اپنی اہم ترمیمات کو سمجھتے ہوئے حزب اختلاف نے صدر پاکستان کے نام اپنے جوابی خط میں کہا تھا کہ تمام غیر ملکی معاہدے بشمول غیر ملکی قرضوں اور امداد کے معاملات واجب العمل ہونے سے پہلے قومی اسمبلی کے سامنے منظوری کے لئے رکھے جانے چاہئیں ہمارے ہاں بجٹ کا بہت بڑا حصہ قرضوں کے اخراجات (DEBT SERVICING) پر صرف ہوتا ہے۔ بھاری غیر منفعت بخش قرضہ جات بغیر کسی جواز کے حاصل کئے گئے ہیں اس کے تمام معاہدوں سے پہلے خاص پارلیمانی اجازت حاصل کی جائے اور ایسے تمام اداروں کو جن پر اکثریتی ملکیت ریاست کی ہر دونوں ایوانوں کی کمیٹی کی نگرانی اور احتساب تلے رکھا جائے اور ایسے اداروں کا بجٹ بھی قومی اسمبلی کے سامنے پیش ہو۔ ایسی ترمیمات پیش کرنے والوں کی رائے میں یہ اس لئے ضروری ہے کہ صدر بھٹو ایک پارلیمانی قائد کی حیثیت سے پارلیمنٹ کی بالادستی اور کنٹرول کے حق میں جھکنے کی بجائے یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح انتظامیہ کو اور دراصل انتظامیہ کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے خود زیادہ اختیارات رکھنا چاہتے تھے۔

بعد میں بجٹ سے متعلق حکومت نے ترمیم کر کے یہ طریق کار اختیار کیا تھا جو وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کے سلسلہ میں تھا یعنی کہ اکثریت اگر وزیراعظم کے ساتھ ہو تو اس کے خلاف اقلیت کے ووٹ نہیں گنے جائیں گے، مگر حزب اختلاف سے آخری موقع پر مفاہمت کے نتیجے میں متحدہ محاذ کی ترمیم منظور کر لی گئی اور اسے یوں تبدیل کر دیا گیا کہ بجٹ کی نامنظوری کے لئے صرف ۱۵ فیصد ووٹ ضروری ہونگے صوبائی حکومتوں کے اختیارات آرڈیننس سے متعلق بھی ایسی ہی ترامیم تھیں۔ اس کے علاوہ عدم اعتماد کی تحریک اور بجٹ کی موجودہ دفعات کی مدت کو بھی پندرہ سال سے گھٹا کر دس سال کر دیا گیا۔

آرڈیننس

دفعہ ۹۲ اس دفعہ میں وفاقی حکومت کو حالات کے تقاضے کے مطابق آرڈیننس وضع

اور نافذ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ آرڈیننس جس پر تین دن کے اندر صدر کے دستخط ضروری ہوں گے۔ پارلیمنٹ کے کسی ایکٹ کی طرح موثر ہوگا۔ اسے چار ماہ کے اندر قومی اسمبلی میں پیش کرنا ضروری ہوگا۔ آرڈیننس کی شکل میں جو کالے قوانین نافذ ہوتے رہے ہیں ان کے اثرات بد آج تک موجود ہیں بلکہ آئین میں ایسے فرامین کو تحفظ بھی دیا گیا ہے نہ تو اسمبلی کی شکل میں قوم کا اعتماد دیا گیا نہ اس کے خلاف جمہور کے غم و غصہ کو در خور اعتناء سمجھا جاتا رہا۔ ان تلخ تجربات کو آئندہ کیلئے دہرانے پر بھی اراکین حزب اختلاف کو مختلف شکلوں میں اپنی رائے ظاہر کرنا پڑی۔

احمد رضا قصوری، امیر زادہ خان کی ترمیموں میں اسے حذف ہی کر دینے کا کہا گیا تھا۔ چوہدری ظہور الٰہی کی ترمیم تھی کہ ایسا اختیار بھی پارلیمنٹ کے قانون سازی کے اختیار نافذ پابندی ہی کے تابع ہونا چاہئے۔ مولانا ظفر احمد انصاری کی تجویز تھی کہ یہ اختیار صرف حالت جنگ کے دوران ہی استعمال کیا جا سکے۔ مزید یہ کہ اس کے نفاذ کے ساتھ ہی فوراً قومی اسمبلی اور سینیٹ کا اجلاس اس کی توثیق کیلئے طلب کیا جا سکے۔ جناب غلام فاروق خان، عبدالحمید جتوئی، میاں محمود علی، راؤ خورشید علی لینے۔ اختیارات سے متعلق ٹیکس لگانے یا منظور شدہ میزانیہ سے زائد کسی خرچ کا استثنا کرانا چاہتے تھے۔

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق کی ترمیم ۲۸۲ یہ تھی کہ آرڈیننس کے اختیارات کو اس بات سے بر مشروط کر دینا چاہئے کہ (بشرطیکہ وہ اس امر میں کتاب و سنت کی پابندی کرے اور قرآن و سنت کے نقیض کوئی آرڈیننس نافذ نہ کرے) انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ جب آپ دفعہ ۲۲۷ کی بنا پر قرآن و سنت کے منافی قانون سازی نہ کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ تو اب چار ماہ تک غیر اسلامی قانون سازی کا دروازہ کھول رہے ہیں سبب کہ ایسے دروازے اب تک کسی قومی اسمبلی کے ذریعے بھی بند نہیں کئے جا سکے۔ کالے قوانین جیسے آرڈیننسوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، انہوں نے ابوبکر صدیقؓ کے پہلے خطبہ کا حوالہ دیا جس میں اپنے ہر حکم کی اطاعت کو انہوں نے قرآن و سنت سے مشروط کر دیا تھا۔

قصوری صاحب نے کہا کہ آرڈیننس کا طریقہ سرمایہ دارانہ استعمار کے باقیات السیئات میں سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ مثلاً اگر پارلیمنٹ صدر کے کسی ایسے فرمان کو مسترد کر دے تب بھی وہ منسوخ نہیں ہو سکتا۔ ایسے کسی نافذ کردہ فرمان کا مقصد دو مہینے میں پورا ہو گیا اسمبلی نے اسے رد کر دیا مگر گورنمنٹ تب بھی پارلیمنٹ کا نافذ قرار دیئے جانے والا کام عملاً جائز قرار پاتا ہے۔

ہنگامہ جنگ کی وجہ سے ہمیں کرنا پڑتا ہے تو مغربی پاکستان جیسے محدود رقبہ کے ارکان کو چھ گھنٹہ کی مہلت میں جمع کرایا جا سکتا ہے۔ عنایت الرحمٰن عباسی اور جہانگیر علی وغیرہ نے دفعات کی تائید کی۔ ڈاکٹر مبشر حسن کے تمام دلائل کے بعد وہی حربہ چلایا جو کثرت استعمال کی وجہ سے کند ہو چکا ہے۔ ارشاد ہوا یہ لوگ سرمایہ دارانہ نظام قائم رکھنے کے لئے آرڈیننس کی مخالفت کر رہے ہیں مگر عوام کی خدمت کا کام جاری رہے گا۔ اور اس طرح تمام متعلقہ دفعات مسترد کر دی گئیں مفتی محمود صاحب اور مولانا عبدالحق نے ترمیم ۸۵۵ میں یہ شق حذف کرنے کو کہا تھا کہ صدر اپنے آرڈیننس پر تین دن میں دستخط نہ کر سکا تو آرڈیننس دستخط شدہ منظور ہو گا۔ مگر پیرزادہ صاحب کی اس یقین دہانی پر مفتی صاحب نے یہ ترمیم واپس لے لی کہ یہاں وفاقی حکومت کا لفظ صدر سے بدل دیا جائے گا۔

دفعہ ۹۷ وزیر اعظم کے انتخاب سے متعلق اس دفعہ میں مولانا نورانی، شوکت حیات، پروفیسر غفور وغیرہ کی ترمیم یہ تھی کہ یہ انتخاب خفیہ رائے دہی کے ذریعہ ہو۔ چوہدری ظہور الٰہی صاحب کی ترمیم ۹۱۴ میں تھا کہ ایسا شخص لازماً اسلام کے پانچوں ارکان کی پابندی کریگا۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہا ۹۱۷ کہ ملکی معاملات سیاسیات سے باخبری کے ساتھ لازمی ہے کہ وہ بدکرداری اور اسلام کی خلاف ورزی کا شہرہ بھی نہ رکھے ۔۔۔ کوئی ترمیم بھی منظور نہ ہو سکی۔

دفعہ ۱۰۰ تا ۱۰۸ گورنر کی تقرری حلف، عہدے کی شرائط وغیرہ سے متعلق ان دفعات میں اسلامی اور جمہوری اہمیت سے متعلق اہم ترامیم یہ تھیں ۔۔۔۔ مفتی محمود مولانا عبدالحق کی مشترک ترمیم ۱۰۱۶ امیر زادہ خان، میاں محمود علی قصوری، راؤ خورشید علی کی ترمیموں میں اس کا انتخاب صوبائی اسمبلیوں پر چھوڑ دینے کا ذکر تھا۔

مولانا عبدالحق کی ترمیم ۱۰۲۲ یہ تھی کہ اس کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ چوہدری ظہور الٰہی نے یہ اضافہ کیا تھا کہ وہ اسلام کے پانچ ارکان کا پابند بھی ہو۔ مولانا انصاری نے کہا تھا کہ وہ اس سے قبل پانچ سال تک کسی بھی سیاسی جماعت کا رکن نہ رہا ہو۔ ترمیمات میں اس کی برطرفی بھی صدر کی بجائے صوبائی اسمبلی کی اکثریت پر چھوڑ دی گئی تھی۔ نیز یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر وہ ملک سے باہر ہو تو صدر قائم مقام گورنر کا انتخاب کرنے کی بجائے صوبائی اسمبلی کا سپیکر یا صوبہ کا چیف جسٹس قائم مقام گورنر ہوگا۔ یا صدر صوبائی حکومت کی سفارش پر قائم مقام متعین کرے گا۔

ایک ہزار سے زائد ترامیم کی کچھ جھلک آپ کے سامنے آگئی۔ اور اس پر حکومت کا رد عمل بھی

ترامیم پیش کرنے والے بے بس تھے اور سوچ رہے تھے کہ ایسے حالات میں اگر آئین منظور ہوتا ہے۔ تو اسکی ذمہ داری کس طرح اپنے سر لے سکتے ہیں۔ دستور سازی کے آخری دن مسٹر نور الامین نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ دستوریہ میں حزب اختلاف اور حزب اقتدار کے نام سے کوئی تقسیم نہیں ہوسکتی سب ارکان صرف اور صرف ارکان دستوریہ ہوتے ہیں مگر یہاں تو اگر سرکاری پارٹی نے ہزار دل وجان سے کسی ترمیم کے حق میں رائے دینی بھی چاہی تو اسی تقسیم کی وجہ سے یہ جرأت نہ ہوسکی، بائیکاٹ کا بامر مجبوری سوچا ہی جارہا تھا کہ ۲۳ مارچ کو لیاقت باغ کے واقعہ ہائلہ کے بعد جلد ہی اسی فیصلہ کی نوبت آگئی اور اس کے بعد آخری دن تک حزب اختلاف کے کچھ آزاد اور کچھ پی پی پی کے ارکان اجلاس سے کنارہ کش ہوگئے۔ مگر پورے مسودہ دستور پر اہم اسلامی اور جمہوری ترمیمات تو پہلے ہی سے داخل ہوچکی تھیں اور وہ اب سب کے سب ایوان کے سامنے آگئی تھیں سپیکر صاحب ہر ترمیم کے محرک کو اس کے نام اور ترمیم کے نمبر سے پکارتے ترمیم ان کے نہ ہونے کی وجہ سے ساقط ہوجاتی مگر اسی طرح ہر مقام پر ایک صحیح بات، اصلاحی تجویز، اسلامی اہمیت سے متعلق ضروری ترامیم ایوان کے سامنے آہی جاتیں۔ اور آخر تک غیر موجودگی میں بھی فریضہ ادائے حق ادا ہوتا رہا۔ البتہ بائیکاٹ کی وجہ سے محرکین بحث کی شکل میں اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا موقع گنوا بیٹھے۔ مگر نتائج تو ان کے ہوتے ہوئے بھی آپ اب تک دیکھ چکے ہیں۔ اور اس سے یہ لازمی نتیجہ بھی نکال سکتے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے بھی آخر تک تمام ترامیم کا یہی حشر ہوتا۔ جن دو ایک اکابر حضرات نے آخر تک ایوان میں حصہ لیکر اسلامی اور جمہوری کوئی ترمیم پیش بھی کی تو اس کا نتیجہ آپ دونوں کی اس تعداد سے (جو صرف ان کا اپنا ہی ووٹ ہوتا۔) معلوم کرسکتے ہیں۔ اب ہم مختصراً دامانِ سخن سمیٹتے ہوئے اسلامی اہمیت سے متعلق ایسی بقیہ ترامیم کا مختصراً ذکر کریں گے۔

حصہ ششم

حصہ ششم کی ۱۶۰ سے لیکر ۱۷۴ تک دفعات میں مالی امور، جائداد کی سرکاری ملکیت، مرکز اور صوبوں میں آمدنی کی تقسیم کا طریق کار قرضوں اور آڈٹ، جائداد، بیرونی معاہدے، ذمہ داریاں مقدمات سے متعلق امور کا ذکر ہے۔ ۱۳۴۰ سے ۱۴۳۸ تک ترمیمات کا تعلق اس حصہ سے تھا۔ اکثر ترمیمات میں قومی اسمبلی کو ایسے امور میں اہم مقام دینے پر زور دیا گیا تھا۔ گویا یہاں سوال صحیح معنوں میں قومی اسمبلی کی بالادستی یا برقرار رکھنا تھا جس کے بارہ میں مسودہ میں بہت جھول

رکھی گئی تھیں۔ معاہدوں کا انعقاد ان پر نظر ثانی امداد کے معاملات وغیرہ امور پر قومی اسمبلی کی منظوری حاصل کئے بغیر عمل پیرا ہونے جیسی باتوں کا ملک کے اقتصادی بحران میں بنیادی حصہ رہا ہے۔ اس لئے مالیات سے متعلق وفاقی حکومت کے تمام معاہدے اور فیصلے قومی اسمبلی کی توثیق کے تابع ہونے چاہئیں۔ ان ایک سو سے زائد ترامیم میں بھی بجز دو ایک لفظی ترمیموں کے کسی ترمیم کو شرف پذیرائی نہ بخشی گئی جبکہ ایک تہائی ترامیم سے زیادہ پیش کرنے والے پی پی پی کے ارکان ایوان میں موجود بھی رہے۔ البتہ بجٹ سے متعلق اسمبلی کی دو تہائی اکثریت کی بجائے سادہ اکثریت کی ترمیم منظور کر دینے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

حصہ ہفتم

عدلیہ

حصہ ہفتم چار ابواب اور ۱۷۵ سے ۲۱۲ تک دفعات پر مشتمل ہے جس کا تعلق عدالت عظمیٰ عدالتوں (سپریم کورٹ ہائی کورٹ) ججوں کی تقرری، شرائط اہلیت، سبکدوشی اور انصاف سے متعلق دیگر امور سے ہے۔

دفعہ ۱۷۵ کے ذیل ۳ میں عدلیہ کو یوم آغاز سے لیکر تین سال کے اندر بتدریج انتظامیہ سے علیحدہ کر دینے کا ذکر ہے۔ ترمیمات میں فوری طور پر ایسا کرنے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کے اندر عدلیہ کو الگ کر دینے کا کہا گیا تھا۔ ان میں مولانا ہزاروی صاحب راؤ صاحب، عبدالحمید جتوئی صاحب منظور حسین، صدر اور احمد رضا وغیرہ کی ترامیم شامل تھیں۔ غالباً ہزاروی صاحب کو ترمیم پیش کرنے کا موقعہ ملا بھی مگر مسترد ہوگیا۔

دیگر اہم ترامیم یہ تھیں کہ صدر چیف جسٹس اپنی صوابدید اور رائے میں چیف جسٹس کی تقرری کرے ۱۔ اسے وزیر اعظم کے مشورے کا تابع بنا دینا قومی مفاد کے منافی ہوگا۔ وزیر اعظم ایک سیاسی شخصیت ہوگی صدر اس محاذ آرائی میں ملوث نہ ہوگا۔ تو وہ اپنی اصابت رائے سے مناسب انتخاب کرنے کی بہتر صلاحیت رکھ سکے گا۔ اس لئے صدر وزیر اعظم سے اس معاملہ میں مشورہ لینے کے باوجود فیصلہ کرنے میں آزاد ہونا چاہیے۔ حزب اختلاف نے تمام عدالتوں پر سپریم کورٹ کے انتظامی کنٹرول کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ یہ صوبائی خود مختاری میں مداخلت نہ تھی بلکہ عدالتوں کو انتظامی کنٹرول سے نکالنا تھا۔ بہر حال اسلام کے نظام عدل وانصاف کا تقاضا تھا۔ پہلے مسودہ میں پارلیمنٹ میں کسی جج کی برطرفی کی

قرارداد پاس کرا گئے۔ عدلیہ کی آزادی کو مجروح کر دینے والی تجویز بھی تھی، مگر اچھا ہوا کہ بحث کے دوران وہ تجویز ختم کر دی گئی۔ اور متحدہ محاذ کی یہ ترمیم عین موقع پر قبول کر کے یہ کہا گیا کہ ججوں کی برطرفی سپریم جوڈیشل کونسل کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو عدلیہ اکثریتی پارٹی کے رحم و کرم پر رہ جاتی۔

اس باب میں چند دیگر اہم ترامیم بھی مفاہمت کے نتیجہ میں مان لی گئیں، ایک یہ کہ خصوصی عدالتوں اور ٹریبونل کے فیصلوں کے خلاف قانونی نکات پر سپریم کورٹ میں اپیل کی جا سکتی ہے۔ دوسری یہ ترمیم کہ مالی بحران کی صورت میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کی تنخواہیں کم نہیں کی جائیں گی تیسری یہ کہ سب سے زیادہ سینئر جج خود بخود ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کا قائم مقام چیف جسٹس بن جائے گا۔

مسودہ کی دفعہ ۱۸۱ میں یہ اختیار صدر کو دیا گیا تھا کہ وہ کسی کو قائم مقام مقرر کر دے۔ اس طرح بھی عدلیہ کی آزادی متاثر ہو سکتی تھی ---- دیگر اسلامی نوعیت کی چند ترامیم یہ تھیں جو منظور نہ ہو سکیں۔ مولانا عبدالحق کی ترمیم نمبر ۱۲۵۵ یہ تھی کہ چیف جسٹس لازماً مسلمان ہونا چاہیئے۔ ترمیم نمبر ۱۲۶۹ بھی ضمنی طور پر اسی غرض سے متعلق تھی۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالحق نے سپریم کورٹ کے ججوں کی شرائط اہلیت میں ترمیم نمبر ۱۲۷۷ میں یہ اضافہ کرانا بھی ضروری سمجھا تھا کہ ایسا کوئی شخص اس وقت تک عدالت عظمیٰ کا جج نہیں مقرر کیا جائے گا جب تک وہ دیگر شرائط مندرجہ کے علاوہ (اسلامی قانون اور اس کے بنیادی ماخذ قرآن و سنت فقہ سے پوری طرح واقف نہ ہو۔) ازہری صاحب مولانا محمد ذاکر مولانا محمد علی نے کہا تھا کہ وہ اسلامی عقائد کا بھی کھلم کھلا منکر نہ ہو۔ اور خود کو عدل پر اثر انداز ہونے والی کسی سرگرمی میں بھی ملوث نہ کرے (نمبر ۱۲۷۶) مزاری صاحب، نورانی صاحب، پروفیسر غفور صاحب، شوکت حیات صاحب نے بھی مسلمان شرط ہونے کی ترمیم داخل کی تھی۔ ترمیم نمبر ۱۲۹۵ عدالت عظمیٰ کے ابتدائی اختیار سماعت میں کسی قانون کے اسلام سے مطابقت نہ رکھنے کی شکایات بھی شامل کرانے کی تھی۔ اور یہ کہ مذکورہ عدالت اسلامی احکام سے مطابقت نہ رکھنے کی حد تک اسے کالعدم قرار دے سکے اسی طرح کسی سرکاری فیصلہ سے معاشی نظام کے تہ و بالا ہونے کی صورت میں بھی رائے کا حق دینے اور اس فیصلہ کو حکومت کو مہلت دے کر ختم کرا دینے کے اختیارات پر بھی خصوصی زور دیا گیا۔

بزنجو صاحب کی ترمیم نمبر ۱۳۰۵ یہ تھی کہ صدر کسی عدالت کے چیف جسٹس کا تقرر صوبائی گورنر کے مشورے سے اور بزنجو صاحب، نورانی صاحب وغیرہ کی رائے میں پاکستان کے چیف جسٹس

کے مشورے سے کرے۔ راؤ خورشید، وحید الصاحب، جتوئی صاحب وغیرہ اس میں عدالت عظمیٰ کے ججوں سے بھی مشورے کا اضافہ کرانا چاہتے تھے۔

دفعہ ۱۹۳ کا تعلق عام عدالت عالیہ کے ججوں کی تقرری سے ہے مولانا عبدالحق نے یہاں نمبر ۵۱۹ تا ۵۲۰ کی شکل میں وہی ترامیم داخل کرائیں جو مسلمان مرد ہونے اور اسلامی قانون کے مآخذ اور اساس سے باخبر ہونے کے بارہ میں تھیں۔

باب ہشتم

الیکشن

ارکان اسمبلی نے الیکشن سے متعلق باب ہشتم میں نمبر ۱۵۹ تا نمبر ۱۷۷ ترامیم داخل کرائی تھیں جمہوریت کی بقاء، اسلام کے فروغ اور انتخابی اداروں کی نشو ونما کے لئے لازمی ہے کہ انتخابات دیانتدارانہ اور آزادانہ ہوں اس مقصد کیلئے۔ اہم ترامیم کا خلاصہ جسے متحدہ محاذ نے اپنے مطالبات میں بھی سمو لیا تھا۔ یہ ہے:

۱۔ صدر چیف الیکشن کمشنر کا تقرر اپنی صوابدید پر نہ کہ کسی سیاسی وزیراعظم کے مشورہ کے تابع ہو کر کرے۔

۲۔ انتخابات عدالتی حکام کی نگرانی میں منعقد کرائے جائیں ترکی وغیرہ کے آئینوں میں بہت سے ناخوشگوار تجربات کے بعد یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ انتظامیہ کے افسران کو افسر بنانے سے انتخابات کی آزادی متاثر ہوتی ہے۔

۳۔ انتخابات افراد کی بجائے پارٹی سسٹم کی بنیاد پر ہوں (مفتی محمود صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب کی ترمیم نمبر ۱۹۲۶ یہی تھی۔) اس سسٹم کی وکالت برسر اقتدار پارٹی نے اپنے منشور میں بھی کی تھی۔ اسی طرح جب انتخابی نتائج پر روپے پیسے کی افراط بھی ختم ہو سکتی ہے۔ سیاسی جماعتوں کو مضبوط بنیادوں پر پھلنے پھولنے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔ اور اس طرح کی جمہوریت صحیح معنوں میں جمہوریت کہلا سکتی ہے کہ ۳۰ فیصد ووٹوں سے کامیاب شخص کو ستر فیصد متفرق ناکام افراد کے مقابلہ میں نمائندگی مل جاتی ہے۔ ۷۰ فیصد شہری اپنی نمائندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مگر پارٹی سسٹم سے سو فیصد افراد کو نمائندگی مل سکے گی۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ پارٹی کے نامزد کردہ صرف اہل اور ممتاز افراد ہی منتخب

ہوسکیں گے۔ اس کے علاوہ ایک فردی اور فضلی جماعتیں بھی خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔

۴۔ انتخابات کے دوران ایک نگران حکومت ضروری ہے، صدر چاہے تو چیف جسٹس وغیرہ کے مشورہ سے انتخابی عرصہ کے لئے ایک نگران حکومت قائم کرے۔

۵۔ رائے دہندہ کی عمر ۲۱ سے گھٹا کر ۱۸ سال کر دی جائے۔

۶۔ چیف الیکشن کمشنر کے لئے مسلمان ہونے کی شرط رکھی جائے۔

۷۔ خفیہ رائے دہی سے وزیر اعظم اور کسی وزیر اعلیٰ کا انتخاب مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ مفتی محمود صاحب مولانا عبدالحق کی ترمیم ۱۹۲۲ مولانا ظفر احمد انصاری ۱۹۴۳ ملک محمد اختر ۱۹۴۲ مزاری صاحب، زرانی صاحب، غفور احمد صاحب، شوکت حیات صاحب ۱۹۴۵ میں کہا گیا تھا کہ یہ استثنیٰ بھی ختم کر دی جائے۔

۸۔ دفعہ ۲۲۴ میں انتخاب اور ضمنی انتخاب کا وقت ساٹھ دن کی بجائے تیس اور نوے کی بجائے ساٹھ کر دیا جائے۔ مگر یہ اور اسطرح کی تمام ترامیم مسترد کر دی گئیں، سوائے دو باتوں کے یعنی رائے دہندہ کی عمر اٹھارہ سال کر دی گئی انتخابات عدلیہ کے ماتحت تو نہیں ہوں گے البتہ انتخابی افسر عدلیہ سے لئے جائیں گے۔

باب نہم

اسلامی احکام

اس حصہ کی حیثیت ہمارے نزدیک گویا آئین کی روح جیسی ہے کیونکہ اس میں ۲۲۷ سے ۲۳۱ تک اسلامی دفعات شامل ہیں۔ اور ابتداء سے علماء ارکان کی یہ سعی رہی کہ یہ حصہ زیادہ سے زیادہ مؤثر اور قوانین کو اسلامی بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ ضمانت مہیا کرنے کے قابل ہو جائے۔

دفعہ ۲۲۷ کی شق ۱ میں ہے کہ مروجہ جملہ قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنایا جائے گا۔ نیز قرآن پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام سے منافی کوئی قانون وضع نہیں کیا جاسکے گا۔ شق ۲ میں ہے کہ اس دفعہ کی تنفیذ صرف آئین کے اس حصہ میں منضبط طریق کار کے مطابق ہوگی یعنی اسے بنیادی حقوق اور دوسرے قوانین کیطرح عدالتی چارہ جوئی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

شق ۳ میں ہے کہ اس دفعہ کا اثر کسی غیر مسلم شہری کے شخصی قوانین یا شہری حیثیت پر نہیں پڑے گا۔

اگلی دفعہ ۲۲۸ میں اس طریق کار یعنی اسلامی مشاورتی کونسل کی تشکیل وغیرہ کا ذکر ہے۔ (۱) جو یوم نفاذ کے نوّے دن کے اندر بنائی جائے گی۔ (۲) اس میں آٹھ سے لیکر پندرہ تک ارکان ہونگے جو صدر ایسے اشخاص ہی سے متعین کرے گا۔ جو قرآن و سنت کے متعینہ اسلامی اصولوں اور فلسفے کا علم رکھتے ہوں یا پاکستان کے اقتصادی، سیاسی قانونی انتظامی مسائل کا فہم ادراک رکھتے ہو۔ صدر ان باتوں کا بھی تقرری میں خیال رکھے گا کہ اس میں تمام مکاتب فکر کی نمائندگی ہو۔ کم ازکم دو ارکان سپریم کورٹ سے متعلق ہوں یا رہے ہوں۔ (پ) کم ازکم چار ارکان ایسے (علماء) ہوں جو کم ازکم پندرہ سال تک اسلامی تحقیق یا تدریس کے کام سے وابستہ چلے آ رہے ہوں۔ کسی رکن کی مدت تقرری تین سال ہوگی دو جج ارکان میں سے ایک، اس کا چیئرمین ہوگا۔

دفعہ ۲۲۹ اسلامی کونسل سے مشورہ طلبی کے بارہ میں ہے کہ ایوان یا صدر یا کوئی گورنر یا دوتہائی صوبائی اسمبلی کی اکثریت کسی متنازعہ مسئلہ کو غور و خوض کیلئے کونسل کے سپرد کر سکتے ہیں۔ دفعہ ۲۳۰ میں اس کونسل کے فرائض ہیں کہ کونسل مسلمانوں کی اجتماعی و انفرادی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے میں پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو سفارشات پیش کرے گی۔ زیر بحث مسئلہ پر رائے دے گی۔ اور یہ کہ کوئی مجوزہ قانون قرآن و سنت کے منافی تو نہیں نیز مروجہ قوانین کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لئے تجاویز مرتب کرے گی۔ نیز اسلامی احکام کی ایک موزوں شکل میں شیرازہ بندی کرے گی۔ جنہیں اسمبلیاں قانونی طور پر نافذ کر سکیں۔

درپیش مسئلہ کا جواب دینے کے لئے مدت متعین کرنا پندرہ دن کے اندر ضروری ہوگا۔ (یعنی پندرہ دن میں جواب نہیں مشورہ دینے کی متعینہ مدت کی اطلاع دے گی جو متعین نہیں کی گئی۔) اس دفعہ کی شق ۳ میں ہے کہ اگر عوامی مفاد میں ضروری ہوا کہ کونسل کے فیصلہ کا انتظار نہ کیا جائے۔ تو اسمبلی قانون سازی ملتوی نہیں کرے گی۔

کونسل تقرری کے سات سال کے اندر حتمی رپورٹ پیش کرے گی۔ نیز سالانہ عبوری رپورٹ بھی، ایسی رپورٹیں وصولی کے چھ ماہ کے اندر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اندر یا کسی صوبائی اسمبلی کے سامنے ۔۔۔ برائے بحث پیش کی جائے گی اور اس رپورٹ پر غور و خوض کے بعد اس کے بارہ میں (نہ کہ اسکی متابعت میں) ہی قانون وضع کرے گی۔

یہ اس باب کا خلاصہ ہے جس میں کچھ باتیں قابل تحسین تھیں (الف) پہلی دفعہ کتاب و سنت کے مطابق قانون سازی (نہ صرف منفی بلکہ مثبت انداز میں) کا ذکر پالیسی کے اصولوں کی بجائے آئین کی ضمن میں آگیا ہے۔ جو قانونی لحاظ سے زیادہ وزن رکھتا، اگر آگے اسے غیر موثر نہ بنا دیا گیا ہوتا۔

اسلامی کونسل کی تشکیل میں علماء کی تقرری و تدریس کے سلسلہ میں بہتر صلاحیت اور استعداد کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

(ج) پچھلے دساتیر میں اسلامی کونسل کی رپورٹوں کی جگہ عموماً سرد خانے ہی ہوتے۔ مگر یہاں رپورٹوں پر عملدرآمد کا ذکر موثر طور پر کر دیا گیا ہے۔ مگر چند باتیں ایسی تھیں جن سے اسلامی احکام اور قانون سازی سے متعلق یہ حصہ بالکل غیر مؤثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ نئی اور پرانی قانون سازی کو اسلام کے مطابق کر دینے والی دفعہ کے نفاذ کے لئے دیگر بنیادی حقوق اور دفعات سے الگ طریق کار (اسلامی کونسل) تجویز کر لیا گیا کہ کسی عدالت میں اسے نہیں لے جایا جا سکے گا۔

۲۔ اگر کونسل کی رائے میں کوئی مجوزہ قانون غیر اسلامی ہے تو اسمبلیاں اس کی متابعت میں فیصلہ کرنے یا اپنا کوئی فیصلہ بدل دینے کی پابند نہیں بنائی گئیں۔

۳۔ کسی متنازعہ قانون کو کونسل کے جواب آنے پر موقوف نہیں کیا گیا بلکہ اگر اسمبلی چاہے تو اس سے پیشتر بھی قانون وضع کر سکتی ہے۔ اور ایسے کسی وضع قانون پر دوبارہ غور کی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔

۴۔ کونسل کے مشورہ لینے کو بھی صدر یا گورنر یا اسمبلی کی اکثریت پر چھوڑ دیا گیا۔ گویا اگر سرکاری پارٹی نہ چاہے تو ایسے کسی استصواب کا موقع ہی نہیں مل سکے گا۔

۵۔ مجوزہ کونسل میں قرآن و سنت کا علم رکھنے والے ارکان کی تعداد ۱۵ میں سے صرف چار ہے جو ایک اقلیت ہونے کی وجہ سے اپنا صحیح فیصلہ کونسل سے نہیں منوا سکتے۔

۶۔ اسلامی کونسل کو اپنا جواب بھیجنے کے لئے محدود مدت کا پابند نہیں بنایا گیا۔

چنانچہ ارکان کی طرف سے اس حصہ کو اسلامی قانون سازی کی ضمانت کا قابل بنانے کیلئے کئی اہم ترامیم آئین اور دستور کی پہلی خواندگی کے دوران بھی علماء نے ان خامیوں کیطرف تفصیل سے روشنی ڈالی اس ضمن میں شیخ الحدیث مولانا عبدالحق کی مفصل تقریر پچھلے شمارہ میں شائع بھی ہو گئی ہے۔

دفعہ کی اصلاح: اہم ترین خرابی یہ تھی کہ اس حصہ کو دیگر قوانین کی طرح کسی عدالت عالیہ میں لے جانے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں مولانا عبدالحق نے ترمیم ۱۲۵۳ اس طرح پیش کی۔

دفعہ ۲۲۵ کی شق ۲ کو اس طرح بدل دیا جائے کہ (کسی قانون کے بارہ میں جب یہ اعتراض اٹھایا جائے کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق نہیں ہے تو اس کی سماعت کا اختیار سپریم کورٹ کے ایک خصوصی بنچ کو ہوگا جسے صدر اس مقصد کے تحت نامزد کرے گا۔ جو پانچ ارکان پر مشتمل ہوگا۔ اور ان کے لئے وہی شرائط ہوں گی جو دفعہ ۲۲۸ کے ذیل ۳ میں اسلامی کونسل کے ارکان کے لئے مقرر کی گئی ہیں۔) ترمیم ۱۶۵۱ بھی اسی کے مترادف تھی جو مولانا عبدالحق اور مفتی محمود کی مشترکہ ترمیم تھی۔ محمود اعظم فاروقی اور صاحبزادہ صفی اللہ نے بھی عدالت عظمیٰ کا مطالبہ ۱۶۵۴ میں دہرایا تھا۔

نیز دفعہ ۲۲۷ کو زیادہ مؤثر بنانے کے لئے مولانا عبدالحق نے ترمیم ۱۶۵۰ میں بھی اضافہ کرانا چاہا کہ (کوئی کوئی ایسا قانون، عاملانہ حکم یا آرڈیننس جو اسلامی احکامات کے متناقض ہو ایسے تناقض کی حد تک کالعدم ہوگا۔)

پارلیمنٹ کی بالادستی یا اسلام کی؟

اس اہم ترمیم کے بغیر اسلامی قانون سازی کی ضمانت ناممکن تھی اس کے جواب میں سرکاری پارٹی، وزیر قانون، یہاں تک کہ صدر محترم تک یہ کہہ کر جان خلاصی کرتے رہے کہ اس طرح تو اسلامی کونسل یا عدالت عالیہ کو پارلیمنٹ پر بالادستی حاصل ہو جائے گی۔ جو جمہوریت کے منافی بات ہے۔ ایوان کے اہل علم حضرات، حزب اختلاف کے زعماء نے پہلی خواندگی کے دوران اس کا مدلل جواب دیا اور کہا گیا کہ جب پارلیمنٹ کو بنیادی حقوق اور دیگر بہت سے جمہوری تقاضوں پر مبنی دفعات میں بالادستی نہیں دی جا رہی اور عدالت عالیہ ان دفعات کے منافی کسی قانون کو کالعدم کرا سکتی ہے۔۔۔ تو آخر کسی قانون کی اسلامی حیثیت متعین کرانے سے جو ایک مسلمان کیلئے تمام حقوق سے بڑھ کر بنیادی حق ہے۔ پارلیمنٹ کی بالادستی کیوں مجروح ہو جاتی ہے۔؟ اور اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو اسلام کو قوت حاکمہ کے طور پر تسلیم کر لینے کا یہ منطقی تقاضا ہے تو بالادستی کے استدلال سے اسلامی قانون سازی پر چھری پھیرنا کیوں ضروری ہو جاتا ہے۔ پھر صدر بھٹو اور اکثریتی پارٹی کو یقیناً معلوم ہے کہ کسی وفاقی آئین میں ہر قانون ساز ادارہ کسی چوکھٹے "لیگل فریم ورک" کے اندر رہ کر کام کرتا ہے۔ موجودہ اسمبلیاں بھی ایک چوکھٹے کو سامنے رکھ کر منتخب ہوئی تھیں آئین بذات خود کسی قانون ساز ادارے کے اختیارات کی حدود کا تعین کرتا ہے۔ کہ ان حدود کے اندر اسے قانون بنانے کے اختیارات حاصل ہوں گے۔

بنیادی اصول اور جائز و ناجائز کی تمیز کئے بغیر حاکمیت مطلقہ کی تو لادینی جمہوریت میں بھی گنجائش نہیں، نہ کسی ایوان کو ایسی کھلی چھوٹ دی گئی ہے بلکہ کسی سٹیٹ کے اساسی نظریات کی حدود میں رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ تو جہاں اسلام سٹیٹ کا سرکاری مذہب ہو اور قرآن و سنت پر مبنی تقنین کو لازمی سمجھا گیا ہو۔ تو کسی قدغن لگائے بغیر بے لگام جمہوریت کو اسلامی احکام و حدود کو رد کرنے کی کب اجازت دی جا سکتی ہے۔ جمہوریت کو سیاست کہنے کے ساتھ ساتھ اسلام کو اپنا دین سمجھنے کا مقصد پھر کیا رہ جاتا ہے۔ اور پھر اسلام کسی سٹیٹ کا سرکاری مذہب آخر بن کیسے سکتا ہے دراصل مغربی کی لادینی جمہوریت کو اسلام کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ قانون اور آئین بنانے کا حق صرف مخلوق کے خالق کو ہے۔ فیصلہ کا مدار اہلیت و صلاحیت ہے۔ اکثریت یا اقلیت پر نہیں ہم "جمہوریت" سے وابستگی جتنی بھی لازمی کیوں نہ سمجھیں اسے اسلام کے تصور حکومت اور نظام خلافت کے تابع کرنا لازمی ہوگا جس طرح سوشلزم ایک کافرانہ مادی نظام ہے مگر جو لوگ اس کا نعرہ لگانا چاہتے ہیں۔ وہ بھی مجبوراً اسے مساوات محمدی کا عکاس بنانا اور اس کا "اسلامیانہ" ضروری سمجھتے ہیں لیکن جمہوریت مادر پدر آزاد شکل میں تمام اسلامی قیود اور حدود سے کھلا رکھ کر نظام سیاست اور نظام قانون سازی بنانا کتنا خطرناک عمل ہے اس کا اندازہ جمہوریت کی مالا جپنے والوں کو موجودہ دستور سازی سے ہو چکا ہوگا کہ اسلام اس جمہوریت کے ہاتھوں کتنا بے بس ہو کر رہ جاتا تھا۔ اسلامی تعلیمات اس بارہ میں صاف اور بالکل واضح ہیں کہ کسی قانونی اور ملکی مسئلہ یا کسی بھی معاملہ میں باہمی نزاع اور اختلاف کی شکل میں اس کا آخری فیصلہ کرانا اور اسکی دینی اور اسلامی حیثیت متعین کرانا خدا اور رسول کا کام ہے۔ فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول۔ ایسے متنازعہ امور میں جس کا فریق اولو الامر انتظامیہ اور حکومت ہی کیوں نہ ہو فیصلہ خدا اور رسول سے کرایا جائے گا۔

مگر کیا ہم ایسے امور خود خدا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں؟ ایسا نہیں ہو سکتا اور نہ رسول کی وفات کے بعد ہم ان کی ذات سے فیصلہ کرا سکتے ہیں ظاہر ہے قرآن کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا۔ تو واضح ہے کہ ایک تیسرا ادارہ ایسا ہونا چاہئے جو کتاب و سنت اور تعلیمات خدا و رسول سے آگاہی رکھتے ہوئے اپنی قوت فیصلہ کے ذریعہ اس تنازع کو ختم کرا سکے اس ادارہ کے ارکان متبحر عالم راسخ العقیدہ مومن خدا ترس اور دیانتدار ہوں گے۔ ان کی بالادستی کتاب و سنت کی بالادستی ہوگی، نہ کہ ایوان کی۔ حاکمیت کی نفی نہیں ہوتی کہ ایسی کوئی حاکمیت کسی کو حاصل ہی نہیں۔ (اور جس کا اعتراف قرارداد مقاصد کے ایک ترمیم کی شکل میں مزید زور شور سے کیا گیا) یہاں معیار بھی صلاحیت اور اہلیت

سے ، اسے پیشوائیت اور پاپائیت سمجھنا حقائق کو مسخ کرنا ہے۔ اس اہلیت کا راستہ اسلام نے ہر فرد کے لئے کھلا رکھا ہے یعنی قوم، نسل، گروہ یا طبقہ کی اجارہ داری نہ ہوگی۔ علم، فن اور اہلیت کی اجارہ داری ہوگی جیسے زندگی کے تمام دیگر فنی اور علمی شعبوں میں ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ انجینئروں، کاریگروں، ڈاکٹروں، وکیلوں، سائنسدانوں کا اسطرح کوئی ترجیحی استحقاق اگر اجارہ داری نہیں سمجھتے مگر ایک اسلام ایسا ہے کہ جس کے بارہ میں آپ کسی بھی اہلیت اور استعداد کے روادار نہ ہوں تو اس سے بڑھ کر اسلام پر اور کوئی ظلم کیا ہو سکتا ہے۔؟

بہرحال اسلام میں حاکمیت صرف خدا، رسول اور اس کی تعلیمات کو ہے نہ کہ کسی عوامی ہڑلونگ اور اکثریت کو ارشاد ربانی ہے: لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث۔ دوسری جگہ مزید وضاحت سے کہا اور "اکثریت" کی قلعی کھولدی۔ وان احکم بما انزل اللّٰہ ولا تتبع اھواءھم (تا) ان کثیراً من الناس لفاسقون۔ بہرحال دفعہ ۲۲۷ کو مؤثر بنانے کیلئے ہمیں ایک تیسرے ادارہ کو فیصلہ کرانے حق دینا ہوگا۔ اگر وہ اسلامی کونسل ہے تو اس کے اختیارات، بالادستی، اور شرائط اہلیت کا پورا لحاظ رکھنا ہوگا اور اگر وہ ایسا نہیں تو سپریم کورٹ کے ایسے ججوں کو یہ حق دینا ہوگا جو کتاب و سنت پر مبنی کسی قانونی حیثیت کا فیصلہ کرانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ مگر بحث اور استدلال کے جتنے بھی پہلو سامنے آئے، کسی کو درخور اعتناء نہ سمجھا گیا نہ آخری وقت میں بھی یہ اہم ترین ترمیم منظور ہو سکی۔ اور یہ اس پارلیمنٹ کی "جمہوری بالادستی" کے نام پر ہوا جسے پنجوں الیات بجٹ الیکشن اور دیگر بیشمار عام دنیاوی امور میں بھی کوئی تنگڑی ترامیم نباتی جاتی رہیں۔ لیکن یہ وہ بنیادی خرابی ہے جسکی اصلاح کئے بغیر آئین کبھی بھی اسلامی قانون سازی کی مؤثر ضمانت نہیں دے سکتا۔

~~۲~~ کی اصلاح | دوسری خامی (پارلیمنٹ کو کونسل کے مشورہ کا پابند نہ بنانے) کا ازالہ مولانا غلام غوث ہزاروی نے ترمیم ۱۹۹ میں اسطرح کہا تھا کہ پارلیمنٹ اور اسمبلی کونسل کی سفارش کو قانونی شکل دے گی مولانا عبدالحق مدظلہ نے ترمیم ۱۹۵ میں کہا تھا (کہ پارلیمنٹ اور اسمبلی رپورٹ آنے پر اسکی متابعت میں قوانین وضع کرے) مولانا ذاکر مولانا محمد علی مولانا ازہری نے کہا تھا کہ (جونہی مشورہ موصول ہو قانون میں حسب مناسب ترمیم کی جائے) یہی ترمیم مولانا انصاری کی بھی تھی۔ مولانا مفتی محمود اور مولانا عبدالحق کی ترمیم ۱۷۱ میں بھی اس کے تابع ہو کر قانون سازی پر زور دیا گیا تھا۔ یہ اہم ترامیم بھی آئین میں جگہ نہ پا سکیں۔

۳ کی اصلاح | کسی متنازعہ قانون کو قبل از مشورہ وضع کرنے کی بھی علماء اور ارکان نے مخالفت

کرتے ہوئے ترمیموں میں اصلاح کی کوشش کی مولانا عبدالحق مدظلہ نے ترمیم ۱۶۹۰ میں کہا کہ اگر اسمبلی کسی ایسے قانون کو وضع کرنے کی التواء مصلحت کے خلاف سمجھے تو کونسل استصواب کئے بغیر وضع کرنے کی بجائے ایک محدود وقت کا کونسل کو پابند بنا کر جلدی مشورہ حاصل کرنے کے بعد اسکی متابعت میں مجوزہ قانون وضع کرے مولانا مفتی محمود اور مولانا عبدالحق مدظلہ کی مشترکہ ترمیم ۱۶۹۱ میں بھی یہی کہا گیا تھا۔ احمد رضا قصوری نے اس شق کو حذف کرنے کا کہا تھا۔ پروفیسر غفور، شوکت حیات، مولانا نورانی، شیرباز مزاری، مولانا ذاکر وغیرہ نے بھی ہنگامی ضرورت پر مبنی اس گنجائش کی مخالفت کی تھی۔

۲ کی اصلاح | کونسل سے مشورہ لینے کو اسمبلی کی اکثریت پر چھوڑنا اس کی افادیت کو ختم ہی کر دیتا تھا۔ اس طرح سرکاری پارٹی اگر نہ چاہتی تو مشورہ طلب کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس کی بھی شد و مد سے مخالفت ہوتی رہی۔ مولانا عبدالحق مدظلہ نے ترمیم ۱۶۷۷ میں دفعہ ۲۲۹ میں اسطرح اصلاح کرانی چاہی کہ پارلیمنٹ (کم از کم پانچ ارکان کی قرارداد پر کونسل کو سوال بھیجا جا سکے گا۔ اور جواب آنے پر اسکی پابندی کرتے ہوئے قانون سازی کی جائے۔) مولانا ازہری مع رفقاء نے بھی پانچ ارکان مولانا انصاری نے کورم کے برابر تعداد اور مولانا غلام غوث ہزاروی نے اختلاف رائے کی صورت میں لازمی طور پر بھیجدینے کا ذکر کیا تھا۔ ان ترمیمات کو پورا تو نہیں مگر حزب اختلاف سے مفاہمت کے نتیجہ میں اس حد تک قبول کر لیا گیا کہ اسمبلی کے ⅖ یعنی ۴۰ فیصد ارکان کی قرارداد پر بھی کونسل کو معاملہ جا سکے گا۔ اس پر حزب اختلاف کو خوشی ہے کہ اب غیر سرکاری ارکان بھی کونسل کو سوالی کے بھیجنے کے مجاز ہوں گے مگر اسمبلی کے موجودہ ارکان کا ⅖ جب کہ ۵۸ ارکان بنتے ہیں۔ تو شاید حزب اختلاف اس ترمیم سے بھی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ تاہم ایک حد تک یہ ترمیم بھی غنیمت ہے۔

۳ کی اصلاح | اسلامی احکام سے متعلق اس حصہ میں کونسل میں علماء ارکان کی اقلیت یعنی صرف چار علماء کا ضروری ہونا بہت بڑی خامی ہے۔ جبکہ ۱۵ ارکان میں باقی ارکان کے لئے علمی و دینی اہلیت نہیں بلکہ سیاسی اقتصادی قانونی اور انتظامی مسائل کا فہم و ادراک کافی سمجھا گیا ہے۔ اولاً تو اسلامی احکام سے متعلق کونسل میں یہ تفریق ضروری نہ تھی بلکہ دین و دنیا سے موصوف جامع علماء پر اکتفاء کرنا تھا اور ایسا ناگزیر تھا۔ تو متبحر علماء کو مجارٹی میں رکھنا لازمی تھا۔ مگر افسوس ایسا نہ ہوا۔ اگر چار علماء کے ساتھ اکثریت فضل الرحمٰن جیسے متجددین کی منتخب کر دیا گیا تو کونسل کا فیصلہ جو اکثریت پر مبنی ہوگا کب کتاب و سنت کے مطابق قانون سازی میں مدد دے سکے گا۔۔۔۔ مولانا عبدالحق مدظلہ نے نہ صرف اس خرابی کے ازالے کو زور دیا تھا بلکہ علماء ارکان کے لئے مبہم طور پر قرآن و سنت کے ستنبط اسلامی اصولوں اور

فلسفہ کا علم اور کم از کم پندرہ سالہ اسلامی تحقیق و تدریس کی شرط اہلیت کو مزید مؤثر بنا سکے۔ نیز اپنی ترمیم ۱۹۴۳ میں کہا (ب۔ ارکین کی اکثریت (نہ کہ صرف چار) ایسے اشخاص پر مشتمل ہو جن میں سے ہر ایک کم از کم پندرہ سال تک کسی معروف و معتمد تعلیمی ادارے میں افتاء یا تفسیر حدیث اور فقہ کی تدریس یا اسلامی تحقیق کا کام انجام دے چکا ہو۔) مولانا غلام غوث نے کم از کم پانچ ارکان مولانا ازہری مولانا ذاکر مولانا محمد علی نے کم از کم دو تہائی، مولانا نورانی پروفیسر غفور وغیرہ نے کم از کم نصف ارکان کا ذکر کیا تھا۔ مولانا عبدالحق مدظلہ نے کونسل میں علماء ارکان کو اکثریت میں رکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ باقی تمام ارکان کے لئے بھی ایسی اہم کونسل میں لازمی شرائط کے طور پر یہ اضافہ اپنی ترمیم ۱۹۷ کے ذریعہ کرانا چاہا کہ فقرہ "ب" کے بعد یہ نئی شق بڑھا دی جائے کہ کونسل کے تمام ارکان کو اپنے کردار اطوار اور دینداری کے لحاظ سے مسلمانوں میں قابل احترام حیثیت حاصل ہو۔) یہ ترامیم تو نہ آسکیں مگر بیگم اشرف عباسی، تسنیم جہان کی ترامیم پر ایک خالص علمی اور تحقیقی کونسل میں ایک خاتون رکن کا اضافہ کر لیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ چیز آئینی کمیٹی میں بھی زیر بحث آئی تھی اور علماء کی مخالفت پر وزیر قانون نے اسے واپس لے لیا تھا۔ مگر آج رہی سہی کسر اسطرح بھی پوری کر دی گئی۔

عورتوں کی آزادی کے لئے اپوا جیسی بیگمات کیا کچھ کرتی ہیں۔ کیا وہ اسلامی احکام کے بارہ میں مخلصانہ رویہ اختیار کر کے کونسل کو حیاء و عفت سے متعلق اسلامی قوانین نافذ کرانے کا موقع دے سکیں گی جبکہ اس طرح انکی آزادی اور اباحیت لازماً متاثر ہوتی ہے۔ کسی ایسی کونسل میں عورتوں کی نمائندگی کی مثالیں ہماری تاریخ میں کم ہی مل سکیں گی۔

۶۔ کی اصلاح | کونسل کو جواب بھیجنے کی مدت متعین نہیں کی گئی، مولانا عبدالحق نے ترمیم ۱۸۸ میں کہا کہ یہ مدت تین ماہ سے زیادہ نہ ہو ——— دفعہ ۲۳۰ کے ذیل ۴ میں اسلامی کونسل کے لئے موجودہ قانون کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی مدت کا ذکر ہے کہ وہ اپنے تقرر سے سات سال کے اندر حتمی رپورٹ پیش کرے گی، مولانا عبدالحق نے ترمیم ۱۹۹ کہ یہ کام سات سال کی بجائے موجودہ قومی اسمبلی کی میعاد اختتام پر وضع کیا جائے۔ تاکہ موجودہ اسمبلی عوام کیطرف سے عائد شدہ فرض کی ادائیگی سے اپنی مدت نیابت میں سبکدوش ہو سکے۔ اور مذکورہ مدت میں بھی کمی آجائے۔

مولانا نورانی، پروفیسر غفور وغیرہ کی مشترکہ ترمیم ۱۹۵ میں سات سال کی بجائے چار سال مولانا انصاری کی ترمیم میں پانچ سال اور پی پی پی کے چوہدری غلام رسول تارڑ صاحب کی ترمیم ۱۹۹ میں سات کی بجائے دو سال پر زور دیا گیا تھا۔ اس دفعہ میں کونسل کو ہر سال ضمنی رپورٹ اور سات سال کے بعد

آخری رپورٹ پیش کرنے کا تو ذکر تھا مگر یہ کہ اسمبلی کتنی مدت میں قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق بنانے کے کام کو مکمل کرے گی اس کی کوئی ضمانت نہ تھی نہ مدت کا تعین تھا۔ اندیشہ تھا کہ پچھلی کونسلوں کی سفارشات اور تحقیقاتی کاموں جیسا حشر اس قسم کی رپورٹوں کا بھی نہ ہو جائے، کیونکہ بغیر اس ضمانت کے کوئی گرفت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ حزب اختلاف کی متفقہ ترمیم میں کہا گیا کہ آخری رپورٹ کے دو سال کے اندر کونسل کی تجاویز کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق تبدیل کرنے کا کام لازماً ختم کر دیا ہے۔ یہ متفقہ ترمیم مفاہمت کی ضمن میں منظور کر لی گئی اور اس طرح اسمبلیوں پر ایک حد تک متعین مدت میں پابندی آگئی ——۔

کونسل میں مختلف مکاتب فکر کو نمائندگی کا ذکر بھی ہے۔ اس کے بارہ میں علماء نے ترمیم پیش کی کہ تعداد اور آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مناسب و متناسب نمائندگی حاصل ہو تاکہ چار فیصد سے بھی کم کسی اقلیتی مکتب فکر کو اہل سنت کے سواد اعظم کی حق تلفی کا موقع نہ رہے۔ اس مفاہمت کے دوران کسی وضع شدہ قانون پر بھی اسمبلی کے از سر نو غور کرنے کی ترمیم منظور کر دی گئی اور سوشلزم سے متعلق ذیلی دفعہ بھی حذف کر دی گئی۔

یہ اسلامی احکام سے متعلق حصہ کا مختصراً ذکر تھا۔ مجموعی حیثیت سے آپ ان تراجیم کی روشنی میں آئین کی اسلامی اور جمہوری حیثیت کے بارہ میں فیصلہ کر سکتے ہیں —— تاہم ان تمام آئینی مذاکرات، آئینی کمیٹی میں علماء ارکان کے مساعی، پہلی خواندگی میں ارکان اور علماء حق کی دینی اور جمہوری نقطۂ نظر کی ترجمانی اور پھر بالآخر بائیکاٹ کی شکل میں آئینی جنگ اور بالآخر حکومتی پارٹی کے مفاہمانہ رویہ سے جو کچھ حاصل ہوا اس کے پیش نظر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ پچھلے تمام دساتیر کے مقابلہ میں یہ آئین بہتر ہے ایک ڈھانچہ کھڑا کر دیا گیا ہے اور آئندہ کوششوں سے اس نیم اسلامی نیم جمہوری نیم عوامی دستور کو مکمل اسلامی بنایا جا سکتا ہے۔ ایسے دستور پر اسی جذبہ مفاہمت ملکی وحدت کی سالمیت کے تقاضوں کے پیش نظر ترامیم پیش کرنے والے ارکان نے بھی **اھون البلیتین** سمجھ کر دستخط ثبت کئے۔ یہ آئینی مساعی نہ تو پوری ناکام ہیں نہ پوری کامیاب کہلا سکتی ہیں۔ مگر تاہم مجموعی حیثیت سے **ایک غنیمت** ہے کہ خداوند کریم نے اتنی بڑی اکثریت کے مقابلہ میں کافی حد تک کامیابی دی ہم نے ان ترمیمات کی شکل میں قوم کے سامنے آئین کی تزئین و تکمیل کا ایک خاکہ رکھ دیا ہے۔ یہ آئندہ لوگوں پر ہے کہ دستور ساز ان ارکان کی فکری اور دماغی اصلاحی کد و کاوش کو ملحوظ رکھ کر آئین کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی مملکت کا جامع عادلانہ اسلامی آئین بنا سکیں۔ دعا یہی ہے

واللّٰہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق